اسلام کا معاشی نظام

بِسْمِ اللّٰہ الرّٰحمٰن الرَّحیم

تقدیم

یہ کتابچہ راقم الحروف کی آج سے تین چار سال قبل کی دو تقریروں پر مشتمل ہے‘ پہلی زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں کی گئی تھی اور دوسری محکمہ محنت پنجاب کے زیر اہتمام مل مالکان اور مزدور لیڈروں کے ایک مشترک اجتماع میں کی گئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ہی تقریریں میں نے حسب عادت ورواروی‘ میں کی تھیں اور میرا ہر گز خیال نہیں تھا کہ ان میں ایسی کوئی خاص یا اہم یا نئی بات ہے۔ لیکن ان دونوں کی پذیرائی میرے اندازے سے بہت بڑھ کر ہوئی۔ خصوصاً فیصل آباد کی تقریر کے صدر تھے ڈاکٹر غلام رسول چوہدری ‘جو خود معاشیات میں پی ایچ ڈی ہیں۔ ان کا تاثر تو اُن کے رقم کردہ پیش لفظ میں قارئین کے سامنے آ ہی جائے گا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اُس اجتماع میں چوہدری صاحب کے علاوہ مزید نصف درجن سے زائد معاشیات کے پی ایچ ڈی موجود تھے۔ بعد میں چائے کے اجتماع پر اُن سب حضرات نے متفقہ طور پر فرمایا کہ آج پہلی بار اسلام کا معاشی نظام کچھ سمجھ میں آیا ہے۔ میں نے اسے کچھ تو اُن حضرات کے حسن ظن پر محمول کیا اور کچھ اس پر کہ میری ہمت افزائی مقصود ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ میں نے اپنی ان تقریروں کو ہر گز قابل اشاعت نہیں سمجھا تھا‘ البتہ یہ ضرور خیال تھا کہ کبھی فرصت ملی تو نظر ثانی کے بعد اشاعت ہو سکتی ہے۔ لیکن محترم چوہدری غلام رسول صاحب نے ان کی اس درجہ قدر افزائی فرمائی کہ دونوں تقریروں کو خود ٹیپ سے منتقل کراکے‘ اپنے ذاتی خرچ پر ایک کتابچے کی صورت میں غالبًا دس ہزار کی تعداد میں طبع کرایا‘ اور مفت تقسیم کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجر عطا فرمائے۔ آمین!

ادھر کچھ عرصہ سے بعض احباب کا شدید تقاضا تھا کہ ہم اسے خود اپنے اہتمام میں بھی شائع کریں۔ اس ضمن میں بھی چوہدری صاحب نے مزید کرم یہ فرمایا کہ کتابت شدہ کاپیاں عنایت فرما دیں۔ چنانچہ یہ کتابچہ بالکل من و عن اُسی صورت میں شائع ہو رہا ہے جس میں چوہدری صاحب نے طبع کرایا تھا۔ اس ضمن میں قارئین سے یہ معذرت کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دونوں تقریروں میں بعض مضامین مکرر آئے ہیں۔ اب یہ آپ کے ذوق پر منحصر ہے‘ چاہیں تو اسے ’قند مکرر‘ سے تعبیر فرما لیں‘ اور چاہیں تو بد مذاقی پر محمول کر لیں۔

میں چونکہ نہ معاشیات کا با ضابطہ طالب علم ہوں نہ فقہ اسلامی کا ماہر‘ لہٰذا اس میں غلطیاں لازماً ہوں گی۔ جو حضرات اس ضمن میں مجھے متنبہ فرمانے کی تکلیف گوارا فرمائیں ان کا پیشگی شکریہ!

------------------

ان دو تقاریر کے علاوہ اس کتابچے میں موضوع کی مناسبت سے دو مختصر چیزیں مزید شامل کی جا رہی ہیں: ایک راقم کا ایک مختصر مقالہ جو اُس نے ’’اسلام کا نظامِ محاصل‘‘ کے عنوان سے لائنز کلب لاہور کے سالانہ اجلاس میں پڑھا تھا۔ اس میں اسلام کے معاشی نظام کے بارے میں بعض اُصولی باتیں تو پھر مکرر آ گئی ہیں ‘تاہم اہل فکر کے لیے چند نئے نکات قابل غور موجود ہیں۔ اور دوسرے پاکستان کے ’نظامِ محاصل‘ کے اس اہم ترین مسئلے پر کہ آیا یہاں کی اراضی عشری ہیں یا خراجی‘ پروفیسر رفیع اللہ شہاب صاحب کا ایک مختصر مراسلہ جو میثاق‘ جنوری فروری ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا تھا‘ جس میں اس موضوع پر نہایت اہم حوالے موجود ہیں۔

**خاکسار اسرار احمد عفی عنہ**

**لاہور ۲۲/ اگست ۱۹۸۵ء**

پیش لفظ

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب دینی حلقوں میں تو کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ڈاکٹرصاحب اس اعتبار سے ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں کہ آپ کی بنیادی تعلیم سائنس اور طب کی ہے ‘مگر آپ کی نمایاں خدمات دین اسلام کی تعلیم و تبلیغ میں نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایسے وقت میں طب کے پیشہ کو ترک کر کے اپنی تمام تر صلاحیتوں اور اوقات کو دین کے احیاء کے لیے وقف کیا جب اُمت قحط الرجال کا شکار تھی‘---- لہٰذا ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال کے شعر ؎

**ہے عیاں فتنہ تاتار کے افسانے سے**

**پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے**

کے مصداق اُمت کی پاسبانی فرمائی۔

راقم الحروف جب ایچی سن کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے تعینات تھا اُس وقت ڈاکٹر صاحب کو وقتاً فوقتاً زحمت دیتا رہا ‘مگر ہر دفعہ ڈاکٹر صاحب نے ہماری دعوت کو شرفِ قبولیت بخشا اور نہ صرف کالج کے طلبہ اور اساتذہ کو اپنے ایمان افروز خطابات سے نوازا بلکہ کالج کی جز وقتی لیکچرر شپ بھی قبول فرما لی۔ اس دوران ڈاکٹر صاحب کے دو اہم خطابات’’نجات کی راہ‘‘ اور’’علامہ اقبال اور ہم‘‘ راقم نے بڑے شوق سے طبع کروائے اور بہت پسند کیے گئے۔

بعد ازاں جب مجھے زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا تو ڈاکٹرصاحب تکلیف فرما کر وقتاً فوقتاً یونیورسٹی تشریف لے جاتے رہے اور خطاباتِ جمعہ کے علاوہ ’’سیرۃ النبیﷺ‘‘ اور ’’اُمت ِمسلمہ کا ماضی‘ حال اور مستقبل‘‘ جیسے اہم موضوعات پر یاد گار خطاب فرمائے اور ڈاکٹر صاحب نے زرعی یونیورسٹی کے سینیٹ اور سنڈیکیٹ کی رکنیت بھی قبول فرما لی۔

راقم کا گہرا احساس یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اللہ نے جو قوتِ استدلال‘

اندازِ بیان اور قوتِ افہام عطا فرمائی ہے وہ اس نے آج تک کسی پروفیسر میں نہیں پائی۔

معاشیات کے میدان میں اسلام کی اصل تعلیمات کیا ہیں؟ یہ وہ مسئلہ ہے کہ جس پر کوئی واضح بات تا حال سامنے نہیں آئی تھی۔ ہماری کوشش زیادہ تر یہی رہی کہ Western Economics میں چند تبدیلیاں کر کے اسی کو اسلام کے مطابق ڈھالا جائے‘ جو مناسب نہیں۔ چونکہ راقم بھی اسی شعبہ ٔعلم سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس کو اِس مضمون سے خاص دلچسپی تھی۔ لہٰذا ہم نے اس معاملے میں بھی ڈاکٹر صاحب سے رجوع کیا۔ اور ڈاکٹر صاحب نے زرعی یونیورسٹی کے کلیہ معاشیات و دیہی عمرانیات کے تحت طلبہ و ماہرین معاشیات سے ’’اسلام کا معاشی نظام‘‘ کے موضوع پر مفصل خطاب فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب کے اس خطاب سے جہاں اسلام کی تعلیمات کے نئے گوشے سامنے آئے وہاں یہ امر سب حاضرین کے لیے حیرت کا باعث ہوا کہ ڈاکٹر صاحب معاشیات کے نہ تو کبھی طالب علم رہے تھے اور نہ ہی اس شعبہ سے کبھی متعلق۔ لیکن اپنی بصیرتِ باطنی کی بنیاد پر ڈاکٹرصاحب ایک بہت بڑے معیشت دان معلوم ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس خطاب میں اسلام کی اصلی تعلیمات کو قرآن حکیم کی محکم آیات کے حوالے سے پیش کیا اور عام معمول کے خلاف ڈاکٹر صاحب نے موجودہ نظاموں میں سے کسی پر اسلام کی مہر تصدیق ثبت کرنے کی بجائے اسلام کی اپنی تعلیمات کو پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ اشترا کی نظام کاآئیڈیل ’’مساوات‘‘ اور سرمایہ دارانہ نظام کا آئیڈیل ’’آزادی‘‘ ہے‘ جبکہ اسلام مساوات اور آزادی دونوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے‘ جب کہ اس کا اصل نعرہ ’’عدل‘‘ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسلام کے ’’روحانی‘‘ اور ’’قانونی‘‘ نظام کا جو فرق بیان فرمایا اس نے تو گویا اس موضوع پر جملہ پیچیدگیوں کو حل کر دیا۔

مجھے اُمید ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ تحقیق و تجسس کی نئی راہیں کھولے گا اور ملکی معیشت کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے ممد و معاون ثابت ہو گا۔

**غلام رسول چودھری**

بِسْمِ اللّٰہ الرَّحمٰن الرَّحیم

اسلام کا معاشی نظام

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَا لِنَا مَنَ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ۔ وَ نَشْھَدُ اَنْ لآَّ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَنَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ فَصَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْرًا کَثِیْرَا --- اَمَّا بَعْدُ :

حضرات! اس دور کے بارے میں ایک بات عام طور پر کہی جاتی ہے جو کچھ زیادہ غلط بھی نہیں ہے کہ یہ معاشیات کا دَور ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج کا انسان بنیادی طور پر معاشی انسان بن کر رہ گیا ہے۔

اجتماعیاتِ انسانی میں بھی یقینا معاشیات اور اِقتصادیات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اور ہمارے ملک میں اسلام کی جانب جو قدم اٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے اس کے ضمن میں فطری طور پر یہ سوال ذہنوں کو پریشان کر رہا ہے کہ اسلام کا اقتصادی نظام کیا ہے؟ بعض لوگوں نے اسلامی اقتصادیات کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی وجہ سے ایک تصور لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہے کہ شاید اسلام کا اقتصادی نظام ہمارے موجودہ نظام میں زکوٰۃ اور عشر کے اضافے اور ذرا مزید ہمت کر کے سود کی لعنت کو ختم کر دینے کا نام ہے۔ گویا معیشت کا بنیادی ڈھانچہ یہی رہے گا اور بس اتنا سا تغیر و تبدل ہی مطلوب ہے۔ اور اسی بنیاد پر کچھ لوگ بدنیتی کے تحت اور کچھ مغالطے سے لوگوں کو بدظن کر رہے ہیں کہ اسلام کے پاس معاشی مسائل کا کوئی حقیقی‘ واقعی اور

مؤثر حل موجود نہیں ہے۔ میں اسی لیے آج یہ جرأت کر رہا ہوں کہ اسلام کے معاشی نظام یا قرآن مجید کی اقتصادی ہدایات کے بارے میں کچھ معروضات پیش کروں۔

حضرات! میں اپنی اصل گفتگو کا آغاز کرنے سے قبل دو معذرتیں پیش کروں گا اور دو مقدمات۔

معذرتیں

**الف:** پہلی معذرت تو یہ کہ اصولاً اسلامی معاشیات پر گفتگو کرنے والے شخص کو جدید معاشیات اور اقتصادیات کا علم بھی براہِ راست ہونا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن و حدیث اور فقہ پر بھی اس کی نظر بہت گہری ہو۔ ورنہ کم از کم کسی ایک میدان کے اعتبار سے تو وہ یہ دعویٰ کر سکے کہ اس کے علم کی تحصیل کسی درجے میں اس نے مکمل کر لی ہے۔ جبکہ مجھے ان میں سے کسی چیز کا دعویٰ نہیں ---- میں اپنے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں قرآن مجید کا طالب علم ہوں۔ البتہ قرآن چونکہ ھُدًی لِّلنَّاسِ (تمام انسانوں کے لیے راہنمائی) ہے اور اس کا اصل موضوع ہی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق رہنمائی دینا ہے‘ لہٰذا اصولاً بھی یہ ممکن نہیں تھا اور فی الواقع بھی ایسا نہیں ہے کہ معاشیات جیسے اہم موضوع پر کوئی ہدایات اس میں نہ دی گئی ہوں۔ چنانچہ اس میں جہاں عبادات کے متعلق احکام بیان ہوئے ہیں اور ان کی حکمتیں بھی زیربحث آئی ہیں‘ اسی طرح زندگی کے تمام گوشے اس میں موضوعِ بحث بنے ہیں اور اس ضمن میں اَحکام بھی وارد ہوئے ہیں اور ان کی حکمتوں کا بیان بھی ہوا ہے۔ معاشیات کے اعتبار سے بھی قرآن مجید میں ایک طرف تو کھلے کھلے احکام بیان کیے گئے ہیں‘ دوسری طرف کچھ ایسے مقاصد اور بنیادی حکمتوں کی نشان دہی کی گئی ہے جن کا لحاظ ان احکام میں رکھا گیا ہے۔ لہٰذا میں ان دونوں پہلوئوں سے کوشش کروں گا کہ اپنے مطالعے کا حاصل آپ حضرات کے سامنے لاؤں۔

**ب :**  دوسری معذرت یہ ہے کہ میں آپ حضرات کے سامنے اپنی بات نہ فلسفیانہ انداز میں پیش کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں اور نہ ہی میں اس کی کوشش ہی

کروں گا۔ میری کوشش یہ ہو گی کہ جن اصطلاحات کے لوگ عادی ہو چکے ہیں انہی کے حوالے سے بات کروں تاکہ بات فوراً سمجھ میں آ جائے۔ مثلاً Capitalism (سرمایہ داری نظام) اور Socialism (اشتراکی نظامِ معیشت)کی اصطلاحات ہمارے ہاں معروف ہیں۔ لوگ اکثر و بیشتر ان اصطلاحات اور ان کے مفہوم سے بنیادی طور پر واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ یہی وہ نظام ہائے معیشت ہیں جو اس وقت بالفعل دنیا میں قائم ہیں (۱) ۔ مجھے خوب اندیشہ ہے کہ اس طرح عین ممکن ہے کہ مجھ پر over simplification کا الزام عائد کیا جائے یا کوئی صاحب یہ سمجھیں کہ میں جدید اصطلاحات سے مرعوب ہوں‘ لیکن اس کے باوجود میں بات پہنچانے کے لیے اس طریق کو اختیار کر رہا ہوں‘ کیونکہ میرے نزدیک بات ذہنوں تک پہنچانے کے لیے یہی طریقہ سب سے مؤثر ہے۔

دو مقدمات

اب میں چاہتا ہوں کہ دو مقدمات آپ کے سامنے رکھوں ‘کیونکہ میری گفتگو انہی پر مبنی (based) ہو گی۔

پہلا مقدّمہ: اس اصول پر مبنی ہے کہ دنیا کے ہر نظام کے دو پہلو ہوتے ہیں: ایک فکری اساس اور دوسرا علمی ڈھانچہ۔ یہ دونوں پہلو باہم مربوط ہوتے ہیں اور کسی بھی نظام کو اس کی فکری اساس سے ہٹا کر موضوعِ گفتگو نہیں بنایا جا سکتا۔ اسی طرح اسلام کے بارے میں نظریاتی اساس اور بنیاد کا معاملہ انتہائی اہم ہے ‘جس کو ہم اصطلاحاً ایمان سے تعبیر کرتے ہیں --- اسلام در حقیقت ایمان پر قائم ہے۔ اللہ پر یقین کہ اس کائنات کا ایک خالق اور مالک ہے۔ اُس نے اس کائنات کو اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی (ایک متعین وقت تک) کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ ہمیشہ باقی رہنے والی چیز نہیں ہے اور ہماری زندگی یہ دُنیوی زندگی

\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_

(۱) ہم اس بات کے مدعی ہیں کہ ہمارے پاس ایک تیسرا نظامِ معیشت ہے ‘ جو ان دونوں کے اچھے پہلوؤں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے‘ لیکن یہ چیز اُس وقت تک صرف ایک دعویٰ کی حیثیت رکھتی ہے جب تک کسی معاشرے یا کسی ملک میں یہ نظام قائم کر کے نہ دکھایا جائے۔

ہی نہیں بلکہ اصل زندگی موت کے بعد ہے۔ انسان کا اصل مسئلہ اُس زندگی سے متعلق ہے‘ اِس زندگی سے نہیں۔ گویا ہماری اعتقادی اساس اور نظریاتی بنیاد کے اعتبار سے نسبت و تناسب (ratio and proportion ) میں اِس دُنیوی زندگی کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں‘ یہ تو گویا نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ عارضی اور فانی ہے جب کہ وہ ابدی ہے اور ہمیشہ کی زندگی ہے۔ یہ ہمارے ایمان کی دو بنیادیں ہیں جو قرآن حکیم کی ایک ہی آیت میں ان مختصر الفاظ میں سموئی ہوئی ہیں: ’’اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَـیْہِ رَاجِعُوْنَ‘‘ کہ اللہ ہی ہمارامبدأ ہے اور معاد بھی ۔ یعنی ہم اللہ کے پاس سے آئے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ ایمان اگر واقعتا دل میں موجود ہو تو اس کا حاصل تو یہی ہے کہ دنیا میں اس طرح زندگی بسر کی جائے جیسے کوئی اجنبی ہو یا راہ چلنے والا مسافر (۱) ایک راہ گزر کو اپنے راستے سے جو دلچسپی ہو سکتی ہے اس دنیا اور اس کے متعلقات کے ساتھ اس سے زائد دلچسپی از رُوئے ایمان درست نہیں ہے۔ اسلام کی اس بنیاد سے دو نتیجے اخذکیجیے۔

(۱) پہلا یہ کہ اگرچہ سوشلزم اور سرمایہ دارانہ نظام بظاہر تو ایک دوسرے کی کامل ضد ہیں‘ کیونکہ نظام کے اعتبار سے ایک مشرق کی بات ہے تو دوسری مغرب کی ‘لیکن فکری بنیاد ان دونوں کی ایک ہی ہے‘ یعنی مادّہ پرستی۔ یہ مادّیت (Materialism) ہی تھی جس نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر جدلی مادّیت (Dialectical Materialism) کی شکل اختیار کر لی ہے۔ مادّیت ہی بنیاد ہے مغربی جمہوریت (Western Democracy) کی کہ جس کے ساتھ کیپیٹلزم کا ضمیمہ لگا ہوا ہے اور اس مادّیت ہی کی ایک زیادہ ترقی یافتہ شکل جدلی مادیت ہے ‘جس سے وہ دوسرا نظام پھوٹا ہے جسے ہم سوشلزم اور کمیونزم یا اس کے مختلف شیڈز (shades ) سے پہچانتے ہیں ---- ایک بات تو یہ پیش نظر رہے کہ اسلام کا معاملہ ان

\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_

(۱) حضور اکرمﷺنے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرiکے شانے پکڑ کرازراہِ شفقت فرمایا: ((کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ)) ’’دُنیا میں اس طرح رہو جیسے کوئی اجنبی یا راہ چلتا مسافر۔‘‘ (صحیح البخاری وسنن الترمذی)

دونوں سے بنیادی طور پر جدا ہے۔ (۱)

(۲) اور دوسری بات ذہن میں یہ رکھنا ہو گی کہ چونکہ اسلام کا نظام اپنے تفصیلی ڈھانچے سمیت صرف اپنی بنیاد پر ہی قائم ہو سکتا ہے اور یہ کسی دوسرے نظام کی پیوند کاری قبول نہیں کرتا ‘لہٰذا پہلے اس نظریاتی بنیاد کا استحکام ضروری ہے ‘اس لیے کہ اسلام کھڑا ہو گا تو ایمان کی بنیاد پر۔

دوسرا مقدّمہ: گو ایمان کی رُو سے اصل اہمیت معاد(آخرت) کی ہے‘ معاش کی نہیں۔ یہ دُنیا اور اس کا ساز و سامان یہیں رہ جانے والا ہے اور انسانوں کے لیے ثانوی اہمیت کا حامل ہے ‘لیکن ساتھ ہی ساتھ اسلام کے پورے نظامِ فکر و عمل میں عدل و قسط اور انصاف کے قیام کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی جو شانیں بیان ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ {قَآئِمًۢا بِالۡقِسۡطِ ؕ} (آل عمران:۱۸) یعنی عدل و انصاف کو قائم کرنے والاہے۔ پھر اسی کا حکم سورۃ النساء میں ان الفاظِ مبارکہ میں وارد ہوا:

{یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُہَدَآءَ لِلّٰہِ } (النساء :۱۳۵)

’’اے ایمان والو! عدل و انصاف کے قائم کرنے والے اور اللہ کے گواہ بنو۔ ‘‘

اور سورۃ المائدۃ میں یہی حکم عکسی ترتیب سے وارد ہوا ہے:

{یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ لِلّٰہِ شُہَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ ۫} (المائدۃ :۸)

’’اے ایمان والو! اللہ کے لیے پوری قوت کے ساتھ کھڑے ہونے والے اور عدل و انصاف کے گواہ بن جاؤ۔ ‘‘

ان سے اہم تر ہے یہ حقیقت کہ قرآن حکیم میں ایسی آیات بھی ہیں جن میں بالکل معین طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ کتابوں کے نازل کرنے اور رسولوں کے بھیجنے کا اصل مقصد اور اسلام کے پورے نظام کا مرکزی خیال ہی عدل و قسط کا نظام قائم کرنا ہے۔

\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_

(۱) اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَاحِدَۃ ۔ کفر کے کتنے بھی رنگ (shades) ہوں ‘کتنی ہی مختلف صورتیں ہوں وہ درحقیقت ایک ہی شے ہے ‘ایک ہی ملت ہے۔

گویا اسلام کے نزدیک یہ ایک اہم قدر ہے۔ فرمایا:

{لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ } (الحدید:۲۵)

’’ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیاں دے کر اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہوں۔‘‘

ابنیاء و رسل کے بارے میں اس عام قاعدہ کلیہ پر مستزاد ہے وہ ہدایت جو معین طور پر نبی اکرم ﷺ کو دی گئی:

{فَلِذٰلِکَ فَادۡعُ ۚ وَ اسۡتَقِمۡ کَمَاۤ اُمِرۡتَ ۚ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ ۚ وَ قُلۡ اٰمَنۡتُ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنۡ کِتٰبٍ ۚ وَ اُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَیۡنَکُمۡ ؕ} (الشوریٰ:۱۵)

’’تو (اے محمدﷺ) آپ اسی دین کی طرف لوگوں کو بلاتے رہیے اور جیسا کہ آپ کو حکم ہوا ہے اسی پر قائم رہیے اور ان کی خواہشات کی پیروی مت کیجیے ‘ اور کہہ دیجیے کہ جو کتاب اللہ نے نازل فرمائی ہے میں اس پر ایمان رکھتا ہوں اور مجھے حکم ہوا ہے کہ تمہارے درمیان انصاف کروں۔‘‘

جب مسلمان ایران پر حملہ آور ہوئے تو ایرانیوں نے حملے کی وجہ دریافت کی‘ تو فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ میں ان کو جواب دیا:

’’ہم تو بھیجے گئے ہیں(خود نہیں آئے) کہ لوگوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان کے نور میں اور بادشاہوں کے ظلم و ستم کے پنجے سے نکال کر اسلام کے عدل میں لے آئیں۔‘‘

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وہ خطبہ جو آپ نے بیعت خلافت کے بعد ارشاد فرمایا تھا اور جو واقعتا ایک اسلامی ریاست کے مقاصد کو متعین کرتا ہے ‘اس میں وہ جملہ یاد رکھنے کے قابل ہے:

’’تم میں سے ہر قوی میرے لیے ضعیف ہے جب تک اس سے حق وصول نہ کر لوں اور تم میں سے ہر ضعیف میرے لیے قوی رہے گا جب تک اس کو اس کا حق نہ دلوا دوں۔‘‘

تو گویا قیامِ عدل و قسط اسلام کا مرکزی خیال ہے۔

حال ہی میں جو سالانہ قرآن کانفرنس کراچی میں ہوئی اس میں ایک صاحب نے بڑی عمدہ بات کی طرف توجہ دلائی کہ اس وقت جو دو نظام دنیا میں قائم ہیں‘ ان میں ایک ایک لفظ مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ کیپیٹلزم کا مرکزی خیال آزادی (freedom) ہے جبکہ کمیونزم کا مساوات (equality) ہے۔ یہ ان لوگوں کے سلوگن ہیں۔ ذہن میں رہے کہ یہ دونوں بڑی اہم انسانی قدریں ہیں۔ لیکن اسلام کا بنیادی

خیال (basic theme) ’’عدل‘‘ ہے۔ وہ آزادی اور مساوات دونوں کو عدل کا پابند کرتا ہے۔ گویا وہ آزادی اور مساوات کے درمیان بھی عدل قائم کرتا ہے تاکہ نہ آزادی اتنی بڑھ جائے کہ مساوات کو بالکل ہڑپ کر جائے‘ یعنی freedom at the cost of equality نہ ہو اور نہ ہی مساوات کا ہوا اتنا بڑھ جائے کہ وہ آزادی کو بالکل نگل جائے‘ یعنی equality at the cost of freedom بھی نہ ہو۔ اسلام کا مرکزی تصور عدل ہے اور وہ اس عدل کو ہر گوشہ زندگی میں نافذ کرنا چاہتا ہے۔

قیامِ عدل و قسط کی اہمیت

انسانی اجتماعیات کے بہت بڑے عالم اور جدید معاشرتی اور سماجی مسائل کی طرف دو صدی قبل توجہ دلانے والے اور ان کا قرآن و حدیث کی روشنی میں حل پیش کرنے والے عظیم مجددِ دین امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی m نے اسلام میں عدل و قسط کے قیام کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے‘ اور اس پر انہوں نے بہت عمدہ دلیل قائم کی ہے کہ اسلام یہ عدل اس لیے قائم کرنا چاہتا ہے کہ اگر کوئی جابرانہ اور ظالمانہ(یا جدید اصطلاح میں استحصالی) نظام رائج ہو جائے تو اس کے نتیجے میں آبادی کی ایک عظیم اکثریت بالکل حیوانوں کی سطح پر زندگی بسر کرنا شروع کر دیتی ہے اور اس کے لیے کسی اعلیٰ سوچ‘ فکر یا خیال کا امکان ہی باقی نہیں رہتا‘ اور اکثریت کو مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ کولہو کے بیل اور باربر داری کے اونٹ کی مانند اپنی دو وقت کی روٹی کے لیے جان گسل محنت میں صبح سے شام تک مصروف رہے ‘تو کہاں اللہ سے محبت کرنا ‘اُس کو چاہنا‘ اُس سے لو لگا کر بیٹھنا یا کسی اعلیٰ فکر کی طرف متوجہ ہونا! (۱) گویا اب انسانوں کے لیے اس مقصد کو پورا کرنا ممکن ہی نہیں رہتا کہ جس کے لیے ان کی تخلیق ہوئی تھی۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی: {وَ مَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَ الۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾} (الذاریات) کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔

لہٰذا اسلام یہ چاہتا ہے کہ نظامِ عدل و قسط قائم ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں

\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_

(۱) ؏ ’’تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے!‘‘

کو موقع حاصل ہو کہ اللہ کی معرفت حاصل کریں‘ اُس سے محبت کریں اور اُس سے لو لگائیں۔

ان دو مقدمات کے بعد اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

اسلام کے دو معاشی نظام

حضرات! اسلام نے معاشی اور اقتصادی معاملات میں عدل و قسط کا جو مقام متعین کیا ہے اور جس میں اُس نے مساوات اور آزادی ایسی دونوں اعلیٰ اقدار کو خوبصورتی سے سمویا ہے وہ نظام کیا ہے؟ (۱) میں اس کی طرف آتے ہوئے ایک بات کہنا چاہتا ہوں جو شاید اکثر لوگوں کو چونکا دے اور یہی میں چاہتا ہوں کہ ذہن بیدار ہو جائیں۔ وہ یہ کہ اسلام کا معاشی نظام ایک نہیں دو ہیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ از ابتدا تا انتہا مکمل ہیں۔ دونوں کا اپنا ایک فلسفہ ہے‘ دونوں کا ایک نظریہ ملکیت ہے‘ نظریہ ٔحقوق‘ نظریہ ٔقدرِ زائد (surplus value) ہے۔ یہ تمام چیزیں وہ ہیں کہ جو کسی بھی معاشی نظام میں بنیادی اہمیت کی حامل ہوا کرتی ہیں ‘اور یہ سب چیزیں ان دونوں میں بالکل جدا جدا ہیں۔ کوئی چاہے تو یوں کہہ لے کہ یہ دونوں ایک ہی نظام کے دو رُخ ہیں۔ لیکن بہر حال ان کے علیحدہ علیحدہ وجود سے انکار ممکن نہیں۔ یہ دونوں نظام باہم ایک دوسرے سے مربوط (inter-connected) بھی ہیں ‘ بہت حد تک ایک دوسرے پر منحصر (interdependent) بھی‘ اور اسلام کی برکات اور اس کے ثمرات کا کامل ظہور ان دونوں کے اجتماع اور اتصال ہی سے ہو سکتا ہے۔

اور یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اگر ان دونوں میں سے ایک پہلو نگاہوں سے اوجھل ہوجائے اور توجہ صرف ایک ہی پر مرتکز ہو جائے تو اس سے جو تصویر سامنے آئے گی وہ اصل حقیقت سے بہت دُور ہو گی۔ ان میں سے ایک اسلام کا رُوحانی و اخلاقی نظام ہے اور دُوسرا قانونی و فقہی نظام۔ ان دونوں کے تقاضے بسا اوقات مختلف ہی نہیں متضاد ہوتے ہیں۔ تاہم ان دونوں کے

\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_

(۱) ایک اہم بات یہ پیش نظر رہے کہ قرآن و حدیث میں نظام اسلامی یا نظامِ مصطفیﷺ کی اصطلاح ہمیں نہیں ملتی۔ اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے اور وہ یہ کہ نظام کوئی جامد شے نہیں بلکہ ہر دور کی علمی اور معاشرتی سطح کے مطابق نظام وجود میں آتا ہے۔ اس سلسلے میں اسلام کی رہنمائی ’’ہدایات‘‘ اور ’’حدود‘‘ کی صورت میں ہے۔ اسلام نے ’’حلال اور حرام‘‘ کی کچھ حدود متعین کی ہیں جن کی جمع و تدوین سے ’’نظام‘‘ وجود میں آتا ہے۔

امتزاج سے اسلام کا کامل نظام وجود میں آتا ہے۔ آپ چاہیں تو ان دونوں پہلوؤں کو ’’دعویٰ‘‘ (thesis) اور ’’جوابِ دعویٰ‘‘ (anti-thesis) سے تعبیر فرمائیں اور ان دونوں کے امتزاج کو synthesis قرار دے لیں۔ ایک چھوٹی اور سادہ سی مثال سے بات واضح ہو جائے گی۔ کوئی شخص آپ کو ایک تھپڑ مار دے تو اگر آپ بالکل عاجز و کمزور ہیں تو اس صورت میں’’قہر درویش بر جانِ درویش‘‘ کے سوا اور کوئی صورت قابل عمل ہے ہی نہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ بدلہ لینے پر قادر ہیں تو آپ کے سامنے دو راستے کھلے ہیں: ایک یہ کہ آپ بدلہ لے لیں اور دوسرے یہ کہ آپ معاف کر دیں۔ اس صورت میں ایک جانب اسلام کا قانونی اور فقہی نظام بدلے اور قصاص کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم فرماتا ہے: {وَ لَکُمۡ فِی الۡقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰۤاُولِی الۡاَلۡبَابِ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۷۹﴾} (البقرۃ) لیکن دوسری طرف اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام ہے جو عفوودر گزر کی تلقین کرتا ہے۔ یعنی اگر معاف کر دو تو یہ تقویٰ اور خدا ترسی سے قریب تر ہے۔ چنانچہ شوق اور رغبت دلانے کے انداز میں فرمایا جاتا ہے: {وَ الۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ وَ الۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ ؕ} (آل عمران: ۱۳۴) یعنی وہ لوگ جو غصہ کو پی جائیں اور لوگوں کو معاف کر دیا کریں۔ دیکھ لیجیے کہ عفوو قصاص ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں‘ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی معاشرہ ان دونوں میں سے صرف ایک پر استوار ہو سکتا ہے۔ دونوں اپنے اپنے مقام پر لازم و ناگزیر ہیں اور حسن معاشرت ان دونوں کے امتزاج ہی سے وجود میں آتا ہے۔

اس پر قیاس کر کے سمجھ لیجیے کہ اسلام کے معاشی نظام کے بھی دو پہلو ہیں۔ چنانچہ ایک جانب قانونی اور فقہی نظامِ معیشت ہے جس کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ یہ ایک نوع کی محدود سرمایہ داری (Controlled Capitalism) ہے‘ اس لیے کہ اس میں انفرادی سرمایہ کاری کی اجازت موجود ہے۔ اگرچہ اسے’’سرمایہ دارانہ نظام‘‘ بننے سے بعض تحدیدی اقدامات نے روک دیا ہے۔ دُوسری طرف اسلام کا روحانی و اخلاقی نظامِ معیشت ہے جس کے بارے میں میں پورے انشراحِ صدر سے عرض کرتا ہوں کہ وہ ایک نہایت اعلیٰ قسم کی روحانی اشتراکیت (Spiritual Socialism) ہے اور ایک ایسا کامل سوشلزم ہے کہ اس کے آگے

کا تصور بھی ممکن نہیں۔ اس لیے کہ سوشلزم یا کمیونزم میں تو پھر بھی انسانی ملکیت کا اثبات موجود ہے‘ اگرچہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی‘ لیکن اسلام اپنی اخلاقی و روحانی اور صحیح تر الفاظ میں’’ایمانی تعلیم‘‘ کی رُو سے انسانی ملکیت کی کلی نفی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں بار بار یہ الفاظ آتے ہیں : {لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ} یعنی آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس سب کا مالک صرف اللہ ہے۔ انسان کسی اور شے کا مالک تو کیا ہو گا ‘خواہ وہ زمین ہو‘ مکان ہو‘ ساز و سامان ہو‘ روپیہ پیسہ ہو‘ وہ تو خود اپنا اور اپنے وجود کا مالک بھی نہیں۔ اُس کے ہاتھ پاؤں‘ اَعضاء و جوارح اور جسم و جان اور اس کی کل توانائیاں سب اللہ کی ملکیت ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں ان کا امین ہوں۔ بقول شیخ سعدیؒ ؎

**ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست**

**در حقیقت مالک ہر شے خدا ست!**

یا بقول علامہ اقبال مرحوم

**رزقِ خود را از زمیں بردن رواست**

**ایں متاعِ بندہ و ملک خدا ست**

اس اعتبار سے بھی ہمارے ہاں بڑی کنفیوژن پائی جاتی ہے۔ سوشلسٹ ذہن رکھنے والے اہل قلم ایسی آیات اور احادیث کو اکٹھا کر کے ہر شے کی ملکیت کی کامل نفی کرتے چلے ہیں اور ضرورت سے زائد اپنے پاس رکھنے کی بھی‘ کہ جب {قُلِ الۡعَفۡوَؕ } (۱) فرما دیا گیا تو زائد چیز جبراً بھی وصول کر لی جائے گی۔ اس طرح وہ ایک کامل اسلامی سوشلزم کا نقشہ پیش کرتے ہیں‘ جب کہ وہ دوسرے پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ حالانکہ قانونِ وراثت بھی اسی قرآن میں موجود ہے‘ اور حضور اکرم ﷺ نے جو نظام برپا کیا تھا اس میں کہیں جبری مساوات دکھائی نہیں دیتی‘ بلکہ اس کے برعکس آزاد معیشت کے مواقع دیے گئے تھے کہ محنت کرو اور جائز ذرائع سے کماؤ ‘اور ان ذرائع سے تم جو کچھ کماؤ گے اس پر تمہارا حق تصرف(جو بہت قریب ہو جاتا ہے حق ملکیت کے) یہاں تک تسلیم کیا جائے گا کہ اس کو وراثتاً منتقل بھی کیا جا سکے۔ دوسری طرف ہمارے ہاں بعض مفکرین اور اصحابِ قلم نے صرف اس قانونی نظام کو اتنا نمایاں کیا ہے کہ

\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_

(۱) یعنی جتنا ضرورت سے زائد ہے اللہ کی راہ میں دے ڈالو ۔ (البقرۃ:۲۱۹)

دوسرا پہلو دب گیا ہے‘ یعنی {قُلِ الۡعَفۡوَؕ } کی آیت ان کی تقریر و تحریر میں نہیں آتی۔

یاد رہے کہ یہ کنفیوژن(الجھن) پورے خلوص کے ساتھ محض غلط فہمی کی بنیاد پر بھی ہو سکتی ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ یہ غلط فہمی ہمارے دورِ اوّل یعنی خلافت راشدہ کے دوران بھی پیدا ہو گئی تھی‘ مثلاً حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ نے غلبہ ٔزہد کے باعث یہ رائے قائم کی کہ ضرورت سے زائد اشیائے صرف اور کسی بھی مقدار میں سونا اور چاندی اپنے پاس رکھنے کی اجازت نہیں۔ آپؓ نے آیۂ کنز (۱) کو بالکل اس کے ظاہری الفاظ پر محمول کیا۔ خلافت راشدہ کے اس نظام میں جس پر تمام امت جمع تھی اس رائے کو ایک انتہائی موقف قرار دیا گیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں انہیں مدینہ منورہ سے باہر چلے جانے کی ہدایت بھی کی گئی۔ ایک بیابان میں انہوں نے جھونپڑا ڈالا اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ (۲) یہ نظامِ اسلامی کا وہ رُوحانی پہلو ہے جس کی طرف اسلام انسانوں کو ترغیب دینا چاہتا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنے تزکیہ اور رُوحانی مراتب کے حصول کے لیے آگے بڑھ سکتا ہے۔ اسلام کے ساتھ ایمان بھی ہے‘ اور اس سے اوپر احسان کا درجہ بھی ہے‘ (۳) مگر اس کو قانونی درجہ دے دینا ایک مغالطہ تھا جو حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کو پورے خلوص اور اخلاص کے ساتھ لا حق ہوا۔لیکن آج یہ مغالطہ جان بوجھ کر اور بدنیتی کے ساتھ دیا جا رہا ہے ‘کیونکہ آج تو خلافت راشدہ کا نظام پورے کا پورا ہمارے سامنے موجود ہے اور اُمت کے اس اجتماعی فیصلے کو نظر انداز کرنا بغیر بدنیتی کے ممکن ہی نہیں۔

\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_

(۱) سورۃ التوبۃ:۳۴

(۲) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے احساس کا یہ عالم تھا کہ وفات کے وقت آپؓ نے زوجہ محترمہ سے فرمایا کہ تم نے یہ کیا سانپ اور بچھو اپنے گرد جمع کر لیے ہیں! تو انہوں نے کہا کہ کہاں ہیں وہ سانپ اور بچھو؟ تو آپ نے معمولی چیزوں جیسے توا‘ چمٹا اور دیگچی کا حوالہ دے کر کہا یہ نہیں پڑے ہوئے میرے گرد؟ حضرت ابوذر ؓکے اسی غلبہ ٔزہد کی وجہ سے آنحضورﷺ نے فرمایا تھا کہ تم میں سے جو چاہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زہد اپنی آنکھوں سے دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ میرے ساتھی ابوذر کو دیکھ لے۔

(۳) حدیث جبریل و سورۃ المائدۃ:۹۳

رُوحانی نظام کے چار اصول

اس روحانی معاشی نظام کے چار اصول ذہن میں پھر مرتب کر لیجیے۔

(۱) انسانی ملکیت کی کلی نفی۔

(۲) انسان کو اس دنیا میں جو کچھ ملتا ہے اس کی کمائی نہیں اللہ کا فضل ہے۔ گو دکان پر وہ بیٹھا ہے‘ کھیت میں ہل اُس نے چلایا ہے‘ محنت اُس نے کی ہے‘ لیکن ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ ملا ہے اس کو اللہ کا عطیہ اور اُس کا فضل سمجھے۔ اگر اسے اپنی محنت کا ثمرہ سمجھو گے تو اس پر اپنا حق ملکیت جتاؤ گے‘ لیکن اگر اللہ کا فضل سمجھو گے تو اس میں سے اپنا حق اسی قدر سمجھو گے جس قدر اللہ نے معین کیا ہے۔

(۳) انسان کا جائز حق کیا ہے؟ صرف اس کی ضروریات کے بقدر۔ ان کو بھی بعض احادیث میں متعین کر دیا گیا ہے۔

ا : اگر دو وقت کھانے کے لیے مل گیا ہے۔

ب: سر چھپانے کے لیے اگر کوئی چھت موجود ہے۔

ج: پہننے کے لیے اگر دو جوڑے کپڑوں کے موجود ہیں۔

د : اور اپنے کردار‘ اخلاق اور عفت کی حفاظت کے لیے اگر ایک بیوی مل گئی ہے۔

تو تمہارا بنیادی حق تمہیں مل گیا ‘اور اس سے زائد جو کچھ ہے وہ تمہارا نہیں دوسروں کا حق ہے۔ اس کو پہنچا دو اُن تک کہ جن کے پاس نہیں ہے اور پھر سمجھو کہ تم غریبوں کی اس امانت کے بوجھ سے سبکدوش ہو گئے کہ جو امتحان کی غرض سے تمہارے مال میں شامل کر دی گئی تھی‘ اور یہی ہے در حقیقت وہ مقام جہاں تک ’’قُلِ الۡعَفۡوَؕ ‘‘ کا سارا فلسفہ پہنچانا چاہتا ہے کہ تمہارے پاس جو بھی ’’قدرِ زائد‘ ‘ہے اس کو مزید کمائی کا ذریعہ نہ بناؤ۔ ضرورت پوری ہو گئی تو تمہارا حق مکمل ہو گیا‘ اب جو زائد تمہارے پاس ہے وہ خواہ قانوناً تمہارا ہے مگر حقیقتاً تمہارا نہیں ہے۔

گویا یہ ایک مکمل نظام ہے‘ اس میں ملکیت اور قدرِ زائد اور یہاں تک کہ

اس قدرِ زائد کا مصرف بھی طے شدہ ہے۔ اس سلسلے میں سورۃ الروم کی ایک آیہ ٔمبارکہ ملا حظہ ہو‘ جس میں ربا(سود) کا ذکر بمقابلہ صدقات آیا ہے۔ فرمایا:

{وَ مَاۤ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ رِّبًا لِّیَرۡبُوَا۠ فِیۡۤ اَمۡوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرۡبُوۡا عِنۡدَ اللّٰہِ ۚ وَ مَاۤ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ زَکٰوۃٍ تُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُضۡعِفُوۡنَ ﴿۳۹﴾} (الروم)

’’اور جو تم سود دیتے ہو کہ لوگوں کے مال میں افزائش ہو تو اللہ کے نزدیک اس میں افزائش نہیں ہوتی‘ اور جو تم زکوٰۃ دیتے ہو اور اس سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی طلب کرتے ہو تو (وہ موجب ِبرکت ہے اور) ایسے ہی لوگ (اپنے مال کو) دوچند‘ سہ چند کرنے والے ہیں۔‘‘

ــگویا دین کی رُوحانی تعلیم کے اعتبار سے ربا در حقیقت صدقہ اور خیرات کے بالمقابل ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص ملازم ہے ‘اس کو تنخواہ ملتی ہے جس سے اس کی ضروریات پوری ہو رہی ہیں اور کچھ سرمایہ اُس کے پاس جمع ہو گیا ہے۔ اس فاضل سرمایہ کے دو مصرف ہیں‘ ایک تو یہ کہ اس کو کسی اور کے کاروبار میں لگا کر اس کی محنت کے بل بوتے پر اس سرمایہ کو بڑھائے(وہ خود تو محنت نہیں کرے گا کیونکہ وہ تو کسی اور جگہ ملازم ہے) یہ بھی در حقیقت اس رُوحانی سطح پر رباہی قرار پائے گا ‘کیونکہ اس روحانی اور اخلاقی سطح پر اس فاضل سرمائے کا مصرف صرف ایک ہے کہ اس کا مالک محتاجوں اور غریبوں کو بنا دیا جائے۔ یہ ان کو دے دیا جائے کہ جو محروم ہیں یا جن کے پاس کاروبارکے لیے بنیادی سرمایہ موجود نہیں ہے۔ گویا فاضل سرمائے کو مزید آمدنی کا ذریعہ بنانا قانونی سطح پر جائز ہے ‘مگر روحانی اور اخلاقی تعلیم میں یہ چیزممنوعات کی فہرست میں داخل ہے۔

قانونی اور فقہی نظام

حضرات! جیسا کہ عرض کیا ہے ‘اسلام کا قانونی اور فقہی نظامِ معیشت ایک طرح کے ’’کنٹرولڈ کیپٹلزم ‘‘سے مشابہ ہے۔ اس میں تمام فطری تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس کی رُو سے انسان کو اپنے مال پر حق تصرف حاصل ہے۔ عام حالات میں صرف زکوٰۃ کی حد تک اس سے جبراً وصول کیا جائے گا‘ (۱) باقی اگر وہ شوق سے چاہے تو اللہ کے راستے میں خرچ کرے اور خیر کمائے۔ لیکن اس کو اس بات کا قانونی حق حاصل رہے گا کہ اپنی ضرورت سے زائد مال کو کاروبار میں لگائے اور اس کو وراثتاً منتقل بھی کرے۔ یہ تمام چیزیںوہ ہیں کہ جو کسی سرمایہ دارانہ نظام میں

\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_

(۱) اس میں خاص حالات میں استثناء ممکن ہے ‘جس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اسلام نے اس قانونی نظام کو بھی ایک حد کے اندر رکھا ہے تاکہ یہ آزاد سرمایہ کاری‘ سرمایہ داری کی لعنت کی صورت اختیار کر کے انسانی معاشرے پر مسلط نہ ہونے پائے۔ اس ضمن میں اسلام نے جو عملی تدابیر اختیار کی ہیں ان کو ان کے فلسفیانہ پس منظر سمیت دو حصوں میں سمجھا جا سکتا ہے۔

الف :یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جب آزادی (خواہ وہ تھوڑی ہی کیوں نہ ہو) دی جائے گی تو کچھ اُونچ نیچ لازماً پیدا ہو گی۔ دوڑ لگے گی تو یقینا کچھ لوگ آگے نکل جائیں گے اور کچھ پیچھے رہ جائیں گے۔ آزادی کو بر قرار رکھتے ہوئے اس فرق و تفاوت سے بچنا ممکن نہیں۔ آزادی خواہ کتنی ہی محدود کیوں نہ ہو‘ جب بھی آئے گی اس بات کا امکان بہرحال موجود رہے گا۔ چنانچہ اس کو کھلے دل سے تسلیم کرنا ضروری ہے۔ لیکن اسلام کے قانونی نظامِ معیشت میں اس بات کا اہتمام بھی کیا گیا ہے کہ معاشرے میں مالی فرق و تفاوت کو کم کیا جائے۔ اس کے لیے اسلام نے زکوٰۃ کا نظام قائم کیا ہے۔ اسلام نے ایک حد قائم کی ہے کہ جو لوگ اس سے اُدھر نکل جائیں ’’دینے والے‘‘یا donors ہیں اور اِدھر والے ’’لینے والے‘‘ یا recipients ہیں۔ اُن کو haves شمار کر لیجیے اور اِن کو have-nots دین کی اصطلاح میں وہ علی الترتیب ’’صاحب ِنصاب ‘‘اور ’’مسکین‘‘ کہلاتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ تقسیم بھی الل ٹپ (arbitrary) نہیں ہے۔ اسے آپ اپنے اختیار سے آگے پیچھے نہیں کر سکتے۔ یہ ایک لائن ہے جو کھینچی جا چکی ہے‘ جس کے پاس اتنے اونٹ ہیں اِدھر اور جس کے پاس نہیں ہیں اُدھر۔ اگر اس قدر سونا ہے تو اِدھر اور نہیں ہے تو اُدھر۔ اور اسی طرح جس کے پاس اتنی چاندی ہے اِدھر اور جس کے پاس نہیں ہے اُدھر۔ اس تقسیم کے بعد وہ نظامِ زکوٰۃ قائم کیا گیاکہ جس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے واضح فرمایا: ((تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِیَائِھِمْ وَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَائِ ھِمْ)) (متفق علیہ) ’’ان کے اغنیاء سے مال وصول کیا جائے گا اور ان کے فقراء کو دے دیا جائے گا‘‘ ۔ تاکہ معاشرے میں پیدا ہونے والی نا ہمواری کا سد باب ہو۔ اور ایسا نہ ہو کہ کچھ لوگ بھوکے اور ننگے رہ جائیں اور ان کی بنیادی ضرورتیں بھی پوری نہ ہوں ‘جبکہ کچھ لوگ اتنا سرمایہ جمع کر لیں کہ کیفیت وہ ہو جائے جس کے بارے میں سورۃ الحشر میں بایں الفاظ متنبہ فرمایا گیا ہے : {کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ ؕ} (آیت ۷) کہ سرمایہ صرف تم میں سے صاحب ثروت

لوگوں کے درمیان ہی گردش میں نہ رہ جائے۔ جس کی ایک سادہ مثال ایک کروڑ پتی کی بیٹی کا لاکھوں روپے کا جہیز لے کر دوسرے کروڑ پتی کے گھر جانا اور کسی امیر کے بیٹے کی سالگرہ پر اُمراء کا لاکھوں روپے کے تحائف کا انبار لگانا ہے۔ اس میں بظاہر سرمایہ گھومتا ہے مگر صرف اغنیاء کے دائرے میں۔ یہ معاشی چکی صرف وہیں گھوم رہی ہے اور اس کا آٹا چھلنی سے چھن کر نچلے طبقوں تک نہیں پہنچ رہا۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ کسی معاشرے میں یا کسی ملک میں جو بھی ذرائع پیدا وار اللہ نے تخلیق فرمائے ہیں ان سے جو کچھ بھی حاصل ہو‘ اس کی ایک منصفانہ تقسیم ہو۔ معاشرے کے تمام افراد پیداوارِ دولت سے متمتع ہوں اور گردشِ دولت صرف بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ ؕ کا مصداق نہ بنے۔

میں جس مفہوم کی ادائیگی کے لیے ’’کنٹرولڈکیپٹلزم‘‘ کی اصطلاح استعمال کر رہا ہوں آج کل اس مفہوم کو internally managed capitalism کے الفاظ سے ادا کیا جا رہا ہے۔ سرمایہ دار بھی اب اس بات کو جان چکے ہیں کہ ننگے اور عریاں کیپیٹلزم کا کوئی مستقبل نہیں‘ وہ تباہی اور بربادی کی طرف جا رہا ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

**دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے**

**کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا**

**تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی**

**جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا**

لہٰذا خود کیپٹلزم اپنے اندر کچھ نمایاں تبدیلیاں کر رہا ہے۔ اس کی بہت نمایاں مثال آپ کو برٹش سسٹم میں ملے گی۔ مثلاً جو لوگ کام پر نہیں ہیں ان کو نان ایمپلائمنٹ الاؤنس دیا جائے یا ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت ریاست اپنے ذمے لے۔ چنانچہ آزاد معیشت بھی ہے کہ جو آگے نکل سکتے ہیں نکلیں‘ لیکن ہر شہری کے لیے اس کی بنیادی ضروریات کی فراہمی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ غور کیجیے کہ اسلام کے نظام میں یہ چیزیں چودہ سو سال پہلے آ چکی تھیں۔ اس ذمہ داری کا اندازہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس تاریخی جملے سے لگایا جا سکتا ہے جس میں آپؓ نے فرمایا کہ ’’ اگر دجلہ اور فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو عمر سے

اس کے بارے میں بھی باز پرس ہو گی‘‘۔ (انسان تو بہر حال اشرف المخلوقات ہے اس کا حق جانوروں سے مقدم ہے۔) اسلام آزادی دیتا ہے کہ کماؤ اور کھاؤ‘ جائز حدود کے اندر اندر خوب محنت کرو۔ کوئی آگے بڑھ جائے اور کوئی پیچھے۔ لیکن یہ معاملہ ایک حد کے اندر اندر رہے اور جو پیچھے رہ جائیں ان کی بنیادی ضروریات کی ضمانت کے لیے زکوٰۃ اور عشر کا نظام قائم کیا گیا۔ کوئی چاہے تو اس کو اجتماعی انشورنس کا نام دے لے۔ اگرچہ اس میں ایک فرق ہے۔ انشورنس کسی بھی نوعیت کی ہو اس کو انسان اپنی کمائی میں سے خرچ کر کے کماتا ہے جبکہ زکوٰۃ اور عشر کے ذریعے سے جو انشورنس اسلام فراہم کرتا ہے اس میں مستفید (beneficiary) کا کوئی contribution نہیں ہے‘ اس کے ادا کرنے والے صرف اغنیاء ہیں۔

ب : اسلام نے مساکین اور صاحب نصاب لوگوں کے مابین فرق و تفاوت کو کم کرنے کے لیے صرف زکوٰۃ کے نظام پر ہی اکتفا نہیں کیا‘ بلکہ اس آزاد سرمایہ کاری پرحلال و حرام کی وہ حدود و قیود قائم کی ہیں کہ جن کی موجودگی میں واقعتا سرمایہ کاری ’’سرمایہ داری‘‘ نہیں بن سکتی۔ ذرا نگاہ ڈالیے ان اقدامات پر اور قرآن مجید کی حکمت بالغہ پر عش عش کیجیے کہ بغیر معاشیات کا کوئی عنوان قائم کیے کیسی بنیادی اور اہم ہدایات دی ہیں۔

دُنیا میں ہمیشہ سرمایہ اور محنت کے امتزاج ہی سے معاشی نتیجہ نکلتا ہے۔ ایک چھوٹا سا خوانچہ بھی اگر آپ لگائیں تو آپ کو سودوسو روپے کا مال لگا کر بیٹھنا ہو گا۔ یہی حال بڑی دکان کا ہے۔ یہاں تک کہ کار خانہ اور مل بھی جو کچھ پیدا کرتے ہیں سرمایہ اور محنت کے امتزاج ہی سے پیدا کرتے ہیں۔ گو جدید ماہرین اقتصادیات خصوصاً سوشلسٹ مصنفین نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ سرمایہ بھی محنت ہی کی پیداوار ہے ‘لیکن یہ بحث در حقیقت مرغی اور انڈے کی نوعیت کی ہے کہ ان میں سے کون سی شے پہلے ہے۔

بہر حال یہ امر مسلم ہے کہ اسلام کے نظامِ معیشت میں زیادہ زور محنت پر ہے اور اسے زیادہ سے زیادہ تحفظ دیا گیا ہے‘ جب کہ سرمائے کی حیثیت

کم سے کم رکھی گئی ہے اور اس کے صرف اپنی ذاتی حیثیت میں earning agent ہونے کو کم سے کم تسلیم کیا گیا ہے --- اور اس کی بد ترین صورت کہ :

(۱) سرمایہ صرف سرمایہ ہونے کی حیثیت سے کمائی کا حق دار ہو۔

(۲) وہ اپنا تحفظ بھی چاہے۔

(۳) گھاٹے میں شریک نہ ہو۔

(۴) اور نفع میں بھی ایک معین شرح لے رہا ہو۔

یہ چار عناصر سود یا ربا کے جزوِ لاینفک ہیں ‘جسے اسلام نے حرامِ مطلق قرار دیا ہے۔ اس لعنت کو جس طرح اسلام نے اپنے نظامِ معیشت میں ختم کیا ہے اور جس طرح اس کی جڑ کاٹی ہے اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ قرآن مجید میں شراب اور بد کاری کے ارتکاب جیسے جرائم پر بھی وہ انداز اختیار نہیں فرمایا گیاجو سود پر کیا گیا ہے۔ کوئی شخص اگر جذبات کی رَو میں بہہ کر کوئی غلطی کر بیٹھا ہے تو اس پر حد تو جاری کی جائے گی ‘لیکن قرآن مجید میں اللہ کا جو غضب اور غصہ سودی کاروبار کرنے والوں پر بھڑکا ہے کسی اور پر نہیں بھڑکا۔ فرمایا کہ اگر تم سود کے لین دین سے باز نہیں آتے {فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ } (البقرۃ:۲۷۹) تو سن لو کہ اللہ اور اس کے رسول کا تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اور حدیث میں تو واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے سب سے بڑے رمز شناس حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ ہماری ذہنی سطح سے قریب تر ہے ۔ آپﷺنے ارشاد فرمایا: ((اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ حُوْبًا اَیْسَرُھَا اَنْ یَنْکِحَ الرَّجُلُ اُمَّہٗ)) (رواہ ابن ماجہ والبیہقی) ’’ربا (سود) کے ستر اجزاء ہیں (یہ گناہ اتنا بڑا ہے کہ اس کے ستر حصے کیے جا سکتے ہیں)اور ان میں ہلکا ترین بھی اس کے مساوی ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں سے زناکرے۔‘‘

یہ انداز بظاہر کھلتا ہے کہ آپﷺ نے یہ اندازِ تعبیر کیوں اختیار فرمایا‘ لیکن جب میں نے غور کیا تو احساس ہوا کہ واقعہ یہ ہے کہ انسان کو بہت سے گناہوں سے

طبعی نفرت ہے۔ خصوصاً ہمارے ہاں ایک نام نہاد ’’دیندار‘‘ مگر اصلاً ’’کاروباری‘‘ طبقہ ہے۔ ان لوگوں کو نماز روزے سے بڑی دلچسپی ہے۔ حج کرنا تو گویا ان کا محبوب مشغلہ ہے‘ اور دارالعلوم اور مساجد بظاہر قائم ہی انہی کے بل بوتے پر ہیں۔ شراب سے ان کو بڑی نفرت ہے اور اگر اس پر زنا کا اضافہ ہو جائے تو گویا قیامت آ گئی۔ مگر سود سے ان کو کوئی نفرت نہیں اور وہ بڑے ذوق و شوق سے سودی کاروبار کرتے ہیں۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے اس کو میزانِ عدل میں تول کر ایک نسبت و تناسب قائم فرمایا ہے اور واضح فرما دیا ہے کہ اس کی اصل حیثیت کیا ہے ‘یعنی معاشرتی برائی ہونے کے اعتبار سے یہ زنا کی بد ترین صورت (یعنی ماں کے ساتھ زنا) سے بھی ستر گنا زیادہ بھیانک ہے۔

بالکل اسی نوعیت کا ہے وہ انداز جو سورۃ الحجرات میں غیبت کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے غیبت کرنے کو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا گیا ہے کہ جس طرح ایک مردہ اپنا دفاع نہیں کر سکتا‘ جیسے چاہو نوچ ڈالو‘ اسی طرح تمہارا جو بھائی موجود نہیں وہ بھی اپنی مدافعت سے قاصر ہے ‘جیسے چاہو اس کی برائی کر لو۔

فی الجملہ ہمارے نظامِ شریعت میں اور احکامِ دین کے اس پورے سلسلے میں جو بدترین برائی قرار دی گئی ہے وہ سود ہے۔ اصل میں یہی وہ چیز ہے جس پر سرمایہ داریپروان چڑھتی ہے اور ہمارے دین میں اس کی جڑ کاٹ دی گئی ہے۔

کاروبار کی وہ صورتیں جو مطلقاً حرام ہیں

سرمایہ جب اپنے بل بوتے پر مارکیٹ کو کنٹرول کرتا ہے اور مارکیٹ میں اتار چڑھائو پیدا کرتا ہے‘ مثلاً ایک شخص سرمایہ کی بنیاد پر کبھی ایک دم بہت سا مال خرید کر قیمتیں بڑھا دیتا ہے اور مارکیٹ کو اونچا لے جاتا ہے اور کبھی ایک دم بہت سا مال ریلیز (release) کرکے مارکیٹ کے بھائو گرا دیتا ہے تو یہ سرمائے کا کھیل بلکہ

ننگا ناچ ہے۔ مارکیٹ میں اس کے جتنے بھی ذرائع ہیں ان کو دین اسلام نے حرام مطلق قرار دیا ہے۔ مثلاً:

(۱)ذخیرہ اندوزی(Hoarding )

اس سلسلے میں سب سے زیادہ زور خوردنی اشیاء (eatables) پر دیا گیا ہے ‘ کیونکہ یہ انسان کی سب سے زیادہ بنیادی ضرورت ہیں۔ اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے باقی اشیائے ضرورت کو بھی۔ آنحضرت ﷺ نے ذخیرہ اندوزی کے بارے میں ارشاد فرمایا:

’’جس نے کھانے پینے کی چیز چالیس دن تک روکے رکھی (بازار میں مانگ ہے مگر وہ اس کو فراہم نہیں کر رہا‘ چاہتا ہے کہ قیمتیں بڑھ جائیں) تو وہ اللہ سے بری ہو گیا اور اللہ اُس سے بری ہو گیا۔ اللہ کا کوئی تعلق اس سے نہیں اور اس کا کوئی تعلق اللہ سے نہیں۔‘‘

(۲) سٹہ (Speculation )

کچھ لوگوں کی ایک معاشی حیثیت متعین ہے اور وہ سٹہ کھیلتے ہیں اور بیٹھے بٹھائے مال کے خرید و فروخت کا چکر چلاتے رہتے ہیں ‘حالاں کہ وہ نہ بالفعل مال خریدتے ہیں اور نہ بیچتے ہیں اور نتیجتاًمارکیٹ میں آنے سے قبل ہی مال پر منافع کی تہیں چڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ تمام پیشگی فرضی سودے سرمایہ داروں کا ایک کھیل ہیں‘ اس کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارے دین میں جو مال موجود نہ ہو اس کا سودا نہیں ہو سکتا سوائے ایک استثنائی صورت کے جسے ’’بیعِ سَلَم‘‘ کہا جاتا ہے۔

(۳)انشورنس(Insurance )

میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مختلف چیزوں کی حقیقت کو سمجھیں۔ بقول علامہ اقبال ؎

**اے اہل نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن**

**جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!**

بعض چیزیں دیکھنے میں بہت خوش نما نظر آتی ہیں لیکن حقیقت میں وہ بھی اسی نوعیت کی ہیں کہ جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ انہی میں ایک انشورنس ہے۔ ہم کسی درجے میں یہ تو جانتے ہیں کہ ہمارے دین میں یہ شے حرام ہے۔ اس کی حرمت کی

حکمت سمجھئے کہ اس حرمت سے کس طرح سرمایہ کاری (جس کی اسلام میں اجازت ہے) گو سرمایہ داری بننے سے روکا گیا ہے۔

**انشورنس کیا ہے؟**

اوّل تو اس میں چانس والا جوئے کا پہلو ہے ‘لیکن اس سے پہلے اس کی اصلیت ہی سرمایہ دارانہ ہے۔ اصل انشورنس تو وہ ہے جو بڑی بڑی فیکٹریوں اور کارخانوں کی ہوتی ہے۔ (۱) ایک سرمایہ دار نے دس لاکھ روپے کے سرمائے سے ایک کارخانہ بنایا‘ فرض کیجیے وہ ایک ماچس کی فیکٹری لگاتا ہے۔ اس کا یہ کار خانہ آفاتِ سماویہ کی زد میں ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی سیلاب آ جائے یا کسی اتفاقی حادثہ میں آگ لگ جائے اور سارا کارخانہ جل کر راکھ ہو جائے‘ لیکن وہ سرمایہ دار اپنے سرمائے کا تحفظ چاہتا ہے انشورنس کے ذریعے سے۔ لیکن وہ یہ تحفظ بھی اپنی جیب سے نہیں کرتا۔ اس کے لیے وہ جو پریمیم (premium ) ادا کرتا ہے اس کو اپنے اخراجات میں داخل کر کے دیا سلائی کی لاگت (cost) میں شامل کرتا ہے اور دیا سلائی کی ڈبیہ کی قیمت اگر ۲۵ پیسے ہے تو اس میں ایک پیسہ یا کم و پیش وہ سرمایہ دار صارف (consumer) سے اپنے سرمائے کے تحفظ کے لیے وصول کر رہا ہے۔ یہ ذہن میں رہے کہ قومی معیشت کے اعتبار سے تباہی ہوگئی‘ ملکی سطح پر دس لاکھ روپے کا نقصان تو ہو گیا لیکن وہ سرمایہ دار اس قومی نقصان سے لاتعلق رہنا چاہتا ہے۔ وہ صارف کی کاسٹ پر اپنے سرمائے کا تحفظ کرتا ہے اور اپنے مستقبل کا بھی۔ وہ یہ تحفظ عوام کی جیبوں پر بوجھ ڈال کر کرتا ہے۔ یہ ہے اصل حقیقت انشورنس کی۔ گویا یہ فی الحقیقت سرمایہ داروں کی ایک کو آپریٹو ہے‘ اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ صرف سرمایہ داروں کے سرمائے کا تحفظ ہے اور {کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ ؕ} کی جیتی جاگتی تصویر ۔یہ سرمایہ داری کی لعنت کو تقویت پہنچانے والی شے ہے‘ جس کی حرمت کا اسلام نے فیصلہ صادر فرما دیا ہے۔

\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_

(۱) لائف انشورنس کے حق میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں سے جوئے کا پہلو نکال دیجیے تو وہ اتنی سخت چیز نہیں رہتی ‘لیکن حرمت کا پہلو بہرحال ہے۔ میں اس کا قائل ہوں۔

معیشت کی نا پسندیدہ یا مختلف فیہ صورتیں

اب تک تو میں نے وہ چیزیں بیان کی ہیں جو حرامِ قطعی ہیں۔ تھوڑا سا نیچے آئیے تو ہمارے دین میں ایک اور دائرہ ہے جس میں اسلام نے کچھ چیزوں کو یا تو حلال رکھا ہے یا یہ کہ ان کی حلت و حرمت میں اختلاف ہے ‘لیکن رُوحِ دین کے اعتبار سے نا پسندیدہ ہیں۔ ان سب کو میں ایک ہی گروپ میں لا رہا ہوں۔

ا: مضاربت

ایک شخص محنت کر سکتا ہے ‘دکان چلا سکتا ہے‘ مگر اُس کے پاس سرمایہ نہیں ہے اور کسی دوسرے شخص کے پاس زائد سرمایہ موجود ہے۔ اب یہ دونوں مل کر کام کرتے ہیں‘ ایک کی محنت ہو گی دوسرے کا سرمایہ۔ اس صورت میں محنت اور سرمایہ کا امتزاج (۱) وجود میں آئے گا اور اس کا نام مضاربت ہے۔ یہ دین میں جائز تو ہے مگر پسندیدہ نہیں‘ جیسے طلاق۔ (۲) اگر کسی کے پاس سرمایہ ہی اتنا ہے کہ جس پر خود اُس کی معیشت کا دار و مدار چل سکتا ہے تو وہ خود دکان لگائے‘ محنت کرے اور رزقِ حلال کمائے۔ لیکن اگر کسی شخص کے پاس اپنی ضروریات کے لیے کوئی اور ذریعہ موجود ہے اور وہ فاضل سرمایہ اپنے ایسے بھائی کو دے رہا ہے جو سرمایہ نہ ہونے کے باعث کسی اور کے سرمائے پر کام کرنے پر مجبور ہے‘ لیکن یہ اُس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے سرمائے کی بنیاد پر اُس کی محنت میں حصے دار بنتا ہے تو یہ جائز توہے ‘کیونکہ اگر کسی بھی درجے میں آزادی کو برقرار رکھنا ہے تو اس نظام میں یہ گنجائش رکھنا پڑے گی۔ لیکن اسلام اس کو بس مجبوراً جائز قرار دیتا ہے‘ جبکہ اس کے نزدیک پسندیدہ چیز وہی ہے جس کا ذکر اخلاقی نظامِ کے تحت ’’قُلِ الْعَفْوَ‘‘ کے حوالے سے گزر چکا ہے۔ لیکن اس میں بھی دیکھئے کہ اسلام نے کس مضاربت کو جائز قرار دیا ہے۔ ہمارے ہاں جو

\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_

(۱) امتزاج کی ایک صورت مشارکت بھی ہے کہ دو آدمی مل کر کاروبار کرتے ہیں‘ دونوں سرمایہ بھی لگاتے ہیں اور دونوں محنت بھی کرتے ہیں ‘تو اس میں کوئی قباحت سرے سے ہے ہی نہیں۔

(۲) (( اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ الطَّلَاقُ)) (رواہ ابوداوٗد وابن ماجہ)

’’جائز کاموں میں اللہ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ شے طلاق ہے۔‘‘

مضاربتیں ہوتی ہیں ان پر قیاس نہ کیجیے۔ لفظ مضاربت کے اشتراک سے یہ نہ سمجھ لیجیے کہ اس نام سے جو کچھ ہے وہ جائز ہے۔ اسلام جس مضاربت کو جائز قرار دیتا ہے اس میں محنت کو پورا پورا تحفظ دیا گیا ہے‘ جبکہ سرمائے کو کوئی تحفظ نہیں دیا گیا۔ اگر نفع ہو گا تو محنت کرنے والے کو اس میں سے حصہ ملے گا‘ لیکن اگر گھاٹا ہو گا تو اس کا کوئی بوجھ محنت کش پر نہیں پڑے گا۔ نقصان کا سارا بوجھ سرمایہ دار کو برداشت کرنا ہو گا۔

یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھیے۔ قرآن مجید میں جہاں تجارت کا ذکر آتا ہے وہاں {عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡکُمۡ ۟} (النسائ:۲۹) (کہ وہ تجارت باہمی رضا مندی سے ہو)کی شرط عائد کی گئی ہے۔ اگر آپ کوئی شے خریدنے بازار گئے ہیں‘ آپ کو اس کا بھائو معلوم ہے ‘آپ قیمت دے کر چیز خرید لیں گے اور معاملہ رضا و رغبت کا ہو گا‘ لہٰذا وہاں یہ شرط پوری ہو جائے گی۔ لیکن کوئی ایسا معاملہ جس میں کوئی شخص بالکل مجبور ہو‘ گو قانونی طور پر تو رضا مندی ہو گئی‘ آپ کہیں گے کہ میں نے کب اس کو مجبور کیا تھا وہ خود میرے پاس آیا ہے کہ میرے پاس سرمایہ نہیں ہے تم مجھے سرمایہ دو‘ میں محنت کر لوں گا اور تمہیں اس میں سے حصہ دوں گا۔ کہنے کو تو رضا مندی ہو گئی‘ لیکن در حقیقت یہ مجبوری ہے ‘کیونکہ اس کے پاس اپنا سرمایہ نہیں۔ اگر ہو تو کوئی کب پسند کرتا ہے کہ کسی اور کو اپنی محنت کے حاصل میں شریک کرے۔ چنانچہ مجبوری کا پہلو اس مضاربت میں موجود ہے جس کی وجہ سے اگرچہ یہ حلال تو ہے مگر پسندیدہ نہیں ہے۔

**ب: مزارعت**

اسی قبیل کی شے مزارعت ہے۔ ایک شخص کی زمین ہے اور کوئی دُوسرا اس پر محنت کر رہا ہے۔ اس مسئلہ میں فقہائے اُمت کے درمیان اختلاف ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ کے نزدیک ہر قسم کی مزارعت حرام مطلق ہے۔ Absentee Landlordism کا ان کی رائے میں اسلام میں کوئی امکان سرے سے موجود نہیں۔ بعض دوسرے فقہاء نے ان احادیث پر غور کرنے کے بعد

اس میں استحسان اور مصالح مرسلہ کے اصول کے تحت کچھ گنجائشیں نکالی ہیں ‘اور یہ بھی میں سمجھتا ہوں کہ چونکہ اُس دَور کے خاص حالات میں ایک موجود الوقت نظام کو کلیۃً بدلنا ممکن نہ تھا‘ لہٰذا کچھ نا گزیر شرائط کے ساتھ ان کی گنجائش پیدا کی گئی تھی‘ ورنہ حضور اکرمﷺ نے تو مزارعت پر لفظ ربا کا اطلاق کیا ہے۔آپﷺ نے حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کو دیکھاکہ وہ ایک کھیتی کو سینچ رہے ہیں‘ جبکہ آپؐ کے علم میں تھا کہ رافع کی اپنی کوئی زمین نہیں‘ لہٰذا آپ ؐنے ان سے دریافت فرمایا کہ کھیتی کس کی ہے اور زمین کس کی ہے؟حضرت رافع ؓنے بتایا کہ کھیتی میری ہے‘ بیج میں نے ڈالا ہے اور محنت بھی میں نے کی ہے ‘جبکہ زمین بنی فلاں کی ہے‘ اور ہمارے مابین پیداوار نصف نصف تقسیم ہوگی۔ اس پر حضورﷺنے فرمایا ((اَرْبَیْتُمَا)) یعنی تم نے رباکا معاملہ کیا‘ ایک سودی کاروبار کیا۔ اور فرمایا کہ زمین اس کے مالک کو لوٹا دو اور تمہارا جو خرچ اس پر آیا ہے وہ اس سے وصول کر لو (سنن ابی داؤد) ۔اس لیے کہ اس میں مالک کی محنت شامل نہیں ہو رہی ہے ‘وہ صرف زمین کی ملکیت کی بنیاد پر اپنے ایک بھائی کی گاڑھے پسینے کی کمائی میں سے حصہ وصول کرنا چاہتا ہے۔

ہمارے ہاں مزارعت کی جو شکلیں رائج ہیں ان میں پھر بھی مالک بیج اور بہت سی دوسری چیزوں میں شامل ہوتا ہے۔ یہ اس حرام کو حلال بنانے کے لیے کچھ اضافی شرائط عائد کی گئی ہیں‘ ورنہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ (۱) کا فتویٰ آنکھیں کھول دینے کے قابل ہے۔ مجھے امام صاحب کی اس رائے سے کاملتاً اتفاق ہے۔

خرید و فروخت کے مروّجہ طریقوں پر قدغنیں

جو مال موجود نہ ہو اس کے سودے کی جو شکل بھی ہو ‘وہ حرام ہے‘ مثلاً:

(۱) ٹھیکے پر زمین دینا۔ مالک نے ایک وقفے کے لیے زمین کی قیمت وصول کر لی ہے۔ اب کاشت کار کو اس سے کوئی بچت ہوتی ہے یا نہیں‘ اس کو اس سے کوئی بحث نہیں۔ گویا یہ تو کھلی ہوئی سود کی صورت ہے‘ اس لیے یہ حرام ہے۔

(۲) باغ میں پھل آنے سے قبل اس کا سودا کرنا بھی نا جائز ہے۔

(۳) یہ تمام ایڈوانس بزنس (advance transactions) جو دنیا میں ہوتے ہیں ان کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ سیدھی سادھی بیع وہ ہے کہ قیمت دو اور مال وصول کرو یا ایک ہاتھ سے چیز لو اور دوسرے ہاتھ سے دو۔ تبادلے کی صورت میں یہاں بھی کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانامقصود نہ ہو۔ ذخیرہ اندوزی یا کوئی اور مفاد پیش نظر نہ ہو۔ ایڈوانس بزنس کے اس طریقے کے باعث over trading ہوتی ہے۔ ایک شخص کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں ‘لیکن وہ پچاس ہزار روپیہ بیعانہ ادا کر کے پچاس لاکھ کے سودے کر لیتا ہے تو اس سے سرمایہ داری کی لعنت جنم لیتی ہے۔ اس کو روکا گیا ہے کہ اگر تمہارے پاس پانچ لاکھ روپیہ ہے ‘تو پانچ لاکھ ہی کا سودا کرو۔ اسلام میں ادھار کی صرف ایک صورت جائز ہے جس کو بیع سلم کہتے ہیں کہ ایک طرف سے پوری جنس یا قیمت ادا کر دی جائے اور دوسری طرف سے مال کی فراہمی یا ڈلیوری کو مؤخر (defer ) کیا جا سکتا ہے۔ لیکن آج کل جزوی ادائیگی کے جتنے بھی سودے کیے جا رہے ہیں ان کی شریعت اسلامی میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(۴) آڑھت

اسی کے ضمن میں آڑھت آتی ہے۔حضور اکرمﷺ نے فرمایا: ((لَا یَبِعْ حَاضِرٌ لِبَادٍ)) (متفق علیہ) ’’کوئی شہر کا آدمی باہر کے آدمی کا مال فروخت نہ کرے۔‘‘

یہ آڑھتی جو منڈیوں میں اڈے جما کر بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ مال جو یہ بیچتے ہیں ان کا اپنا نہیں ہوتا اور کئی دفعہ مال موجود بھی نہیں ہوتا‘ وہ صرف اپنے اڈے کی وجہ سے فروخت کنندہ اور گاہک دونوں سے کمیشن وصول کرتے ہیں۔ ایک شخص

نے گندم بوئی ہے تو وہ خود فروخت کرے اور اگر اس شہر والے کے پاس گندم کی قیمت موجود ہے تو پہلے پوری گندم خرید لے اور پھر اپنے پاس سے اسے فروخت کرے۔ اس اعتبار سے دیکھئے کہ یہ کس قدر دُور رَس ہدایت ہے جو نبی اکرم ﷺ نے دی ہے ‘ورنہ ہمارے ہاں اجناس کی قیمتوں کو بڑھانے والے اور گوشت کی قیمتوں کو چڑھانے والے یہی آڑھتی ہیں۔ لہٰذا اسلام نے ان کے عمل دخل کو کم کیا ہے۔

مڈل مین (MIDDLE-MAN): جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ‘اسلام نے اپنے معاشی ڈھانچے میں ’’مڈل مین‘‘ کے عمل دخل کو حتی الوسع کم کیا ہے۔

تقسیم دولت کے لیے اقدامات

(۱) وراثت : اسلام کا قانونِ وراثت ارتکازِ دولت کو ختم کرتا ہے۔ ایک شخص کی جائیداد کا وارث کوئی دوسراایک ہی شخص نہیں بنتا بلکہ وہ جائیداد اور سرمایہ بٹ کر بہت سے لوگوں کو ملتا ہے۔

(۲) انفاق فی سبیل اللہ اور نفلی صدقات۔

انسانی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر دولت کمانا

جس طرح اسلام دولت کمانے کے لیے کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دیتا بالکل اسی طرح انسانی کمزوریوں کو مشتعل (exploit) کر کے دولت کمانے کی بھی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مثلاً:

(۱)جنسی جذبہ (Sex): جنسی جذبہ انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ قرآن مجید نے انسانی شر مگاہ کو ’’فرج‘‘ کہا ہے۔ فرج کے لغوی معنی

ہیں اندیشے کی جگہ۔ فصیل میں جہاں دراڑ ہے وہ فرج ہے ‘جہاں سے غنیم کے در آنے کا یعنی حملہ آور کے اندر داخل ہونے کا موقع ہو۔ لہٰذا انسان کے اس جنسی جذبہ کو مشتعل کر کے پیسہ کمانے کو حرامِ مطلق قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح ساری فلم انڈسٹری‘ قحبہ گری کا کاروبار اور فحش لٹریچر کی طباعت و اشاعت اور خرید و فروخت کا دھندا ختم ہو جاتا ہے۔

(۲) شراب پر پابندی: اسی طرح شراب بھی حیوانی جذبات کو مشتعل کرتی ہے‘ چنانچہ اس کے بنانے‘ کشید کرنے‘ پینے پلانے اور خریدنے اور بیچنے کو حرامِ مطلق قرار دیا گیا ہے۔

(۳) فضول خرچی: انسان اکثر و بیشتر دولت کماتا ہے تعیش کے لیے‘ لیکن اسلام میں عیاشی کے تمام دروازے بند ہیں۔ قرآن مجید میں تبذیر(فضول خرچی اور نمود و نمائش پر خرچ کرنے) سے روکا گیا ہے۔ اور اس کے مرتکب افراد کو شیطان کے بھائی قرار دیا گیا ہے۔ گویا اس طریقے سے بھی اسلام نے دولت کے ساتھ انسان کی محبت (attachment) کو کم کر دیا ہے۔ تو پھر کوئی شخص سرمائے کو کیوں چاہے گا؟

قصہ مختصر سرمایہ داری کی لعنت پر اسلام کا حملہ کسی ایک جانب سے نہیں بلکہ مختلف اطراف سے ہے۔

تو یہ ہے وہ نقطئہ عدل‘ کہ آزادی بھی بر قرار رہے ‘یعنی اسلام میں جبری مساوات نہیں‘ لیکن اس بات کا معقول انتظام ہے کہ عوام کے درمیان معاشی نا ہمواری ایک حد سے بڑھنے نہ پائے۔ رہی وہ جبری اور کلی مساوات جس کی تعلیم سوشلزم دیتا ہے تو وہ دُنیا میں آج تک کبھی قائم نہیں ہوئی۔ اور فطرتِ انسانی سے بالکل بعید ہے۔

دو گنجائشیں

(۱) ٹیکسز کی وصولی: ایک طرف اسلام نے اس بات کی گنجائش رکھی ہے کہ اگر کسی وقت زکوٰۃ

اور عشر کی حاصل شدہ آمدنی یا خمس اور اس نوعیت کے دوسرے محصولات مثلاً فے وغیرہ سے حاصل شدہ رقوم (۱) ایمرجنسی کے حالات میں کفالت عامہ کے لیے کافی نہیں ہوتیں تو اسلام غرباء اور مساکین کی وکیلِ عام اسلامی ریاست کو حق دیتا ہے کہ وہ زکوٰۃ وغیرہ سے زائد جبراً بھی وصول کرے۔ یعنی یہ حق ملکیت اس طرح کی sanctity اور اس نوع کا تقدس نہیں رکھتا کہ جو ایک سرمایہ دارانہ نظام میں اس کو حاصل ہوتا ہے۔

(۲)قومیانا (Nationalisation):

دوسری طرف اگر کسی ذریعہ پیداوار کو پبلک سیکٹر میں رکھتے ہوئے عدل کا تقاضا پورا نہ ہونے پائے تو اسلامی ریاست میں اس ذریعہ پیداوار کو قومیانے (Nationalise ) کی گنجائش بھی موجود ہے‘ کیونکہ اصل شے عدل ہے۔ اگر عدل کا تقاضا پورا نہیں ہوتا تو کسی بھی صنعت وغیرہ کو قومیانے میں کوئی قدغن اسلام کی رُو سے نہیں ہے۔

اس کی سب سے بڑی دلیل حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اجتہاد ہے۔ جب عراق کی زمینیں فتح ہوئیں اور دجلہ و فرات کی سر زمین اور شام اور فلسطین کے انتہائی زرخیر علاقے اور سبزہ زار مسلمانوں نے فتح کیے تو مطالبہ کیا گیا کہ ان کو مجاہدین کے اندر تقسیم کر دیا جائے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس پر غور کیا اور یہ بڑا نزاعی مسئلہ بنا رہا۔ اس پر بڑی لے دے ہوئی‘ مجلس شوریٰ کے اجلاس منعقد ہوئے۔ دونوں طرف سے بھر پور دلائل دیے گئے ‘لیکن آخر کار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد پر اجماع ہوا کہ ایسا کرنے سے عدل کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے۔ لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سب زمینیں اسلامی ریاست کی ملکیت (سٹیٹ لینڈ) ہوں گی اور اس پر کام کرنے والے مزارعے (tenants) کی حیثیت سے بر قرار رہیں گے۔ وہیں کے لوگوں کو حقوق دے دیے گئے۔ اگرچہ وہ ملکیت کے حقوق نہیں تھے لیکن ایک نوع کی موروثی مزارعت تھی کہ وہ ان میں زراعت کریں گے اور اسلامی ریاست ان سے لگان یا خراج وصول کرے گی۔ ذہن میں رکھیے کہ اگر خدا نخواستہ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اجتہاد سامنے نہ آتا تو دُنیا

\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_

(۱) یہ سب اسلامی ریاست کے محاصل ہیں اور ان سب کا بڑا حصہ وہ ہے کہ جو رضی اللہ عنہave-nots کی کفالت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اسلامی ریاست میں taxes کی اجازت ہے۔

میں بد ترین جاگیرداری نظام اسلام کے ذریعے سے رائج ہو جاتا‘ کیونکہ عراق اور شام کے فاتحین کی تعداد محض چند ہزار تھی‘ اور اگر وہ تمام زمینیں ان میں تقسیم کر دی جاتیں تو وہ سب بڑے بڑے جاگیر دار بن جاتے۔

آخری بات

میں نے یہ دو نظام آپ کے سامنے رکھے ہیں۔ اسلامی ریاست میں یہ نظام علیحدہ علیحدہ نہیں ہوتے‘ بیک وقت موجود ہوتے ہیں۔ اسلامی نظام کی برکات کا ظہور صرف اس قانونی نظام سے نہیں ہو گا۔ میں واضح کر دوں کہ جب تک معاشرے میں بالفعل ایسے لوگ موجود نہ ہوں جو ایمانی اور روحانی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہوں‘ یہ مقصد حاصل نہ ہو سکے گا۔ ایک ہمارا معاشرہ ہے جس میں اصل قدر دولت کی ہے۔ جس کے پاس دولت و سرمایہ ہے وہ صاحب عزت ہے۔ اس سے بڑے سے بڑا نیک آدمی بھی جھک کر ملے گا۔ دوسری طرف ذرا چشم تصور میں لائیے شیخ احمد سر ہندی یا سلطان الہند نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہماکو جو قرآن کی ایمانی تعلیمات کا مظہراتم ہیں ‘ان کو دنیا کی کسی شے سے کوئی رغبت نہیں ہے‘ وہ دنیا کی کسی شے کی ملکیت حاصل کر کے بھی فخر کرنے والے نہیں۔ دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کو چھت اگر ہے تو کافی ہے۔ اس پر مزید حصول کی ان کے سامنے کوئی اہمیت ہی نہیں۔ ان کی زندگی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ دولت کے انبار اور شاہی سلطنت کا جاہ و جلال ان کو متاثر نہیں کرتا اور وہ عملی نمونہ ہیں ’’قل العفو‘‘ کی قرآنی تعلیم کا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو inspire کرتے ہیں اور ان سے معاشرے میں اقدار کا تعین ہوتا ہے جن کی موجودگی میں وہ ایمانی حقیقت سامنے رہتی ہے کہ اصل مسئلہ ’’معاش‘‘ کا نہیں‘ دنیا کی خاطر دوڑ دھوپ کا نہیں‘ بلکہ ’’معاد‘‘ کا ہے‘ آخرت کا ہے۔ اصل چیز دولت و ثروت نہیں ‘نیکی اور عمل صالح ہے۔ اللہ کی محبت‘ اس کی بندگی اور اس کے رسول ﷺ کی محبت اور ان کی سنت کا اتباع ہے۔ اور اگر روشنی کے یہ مینار بالفعل موجود نہ ہوں تو میں یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ صرف قانونی نظام سے اسلام کی برکات کا ظہور کبھی نہیں ہو گا۔

اس بات کو نا گزیر ضرورت کی حیثیت سے اپنے سامنے رکھیے کہ معاشرے میں حضرت ابو ذر غفاریh کی مثال کو زندہ رہنا چاہیے۔ ہمیں اصحاب ِصفہ کا فقر سامنے رکھنا چاہیے کہ ان کے پاس لنگوٹیاں تھیں تو اتنی کہ سجدے میں جاتے ہوئے ان کو اندیشہ ہوتا کہ کہیں ان کا ستر نہ کھل جائے‘ پیچھے والے ان کا ننگ نہ دیکھیں۔ منتظر رہتے کہ جب سب لوگ سجدے میں چلے جائیں تو وہ سجدے میں جائیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے سب کچھ تج دیا تھا اللہ اور اس کے رسولﷺ کے واسطے۔ انہی میں سے ہیں حضرت ابوالدرداء ‘ حضرت انس بن مالک‘ حضرت مقداد‘ حضرت ابو ہریرہ اور انہی میں ہیں حضرت ابو ذر غفاری بھی ۔رضی اللہ عنہم اجمعین۔ اگر معاشرے میں بالفعل وہ لوگ موجود نہ ہوں جن کے بارے میں حضور اکرمﷺ نے فرمایا کہ وہ لوگ بھی ہیں کہ کہیں رشتہ کرنا چاہیں تو کوئی انہیں رشتہ نہ دے‘ کسی کی سفارش کرنا چاہیں تو کوئی ان کی بات ہی نہ سنے۔ لیکن اللہ کے ہاں ان کا مقام یہ ہے کہ کسی بات پر اگر وہ اللہ کی قسم کھا بیٹھیں تو اللہ ان کی قسم کی لاج رکھے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ’’پیکر محسوس‘‘ کے خوگر انسان اپنی آنکھوں سے ایسے لوگوں کو دیکھیں اور پھر ان میں جذبہ بیدار ہو قربانی کا ‘خدا پرستی کا‘ سادگی کا۔

آخر میں یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دین کل کی حیثیت سے ایک وحدت (organic whole ) ہے۔ ہم نے اپنی سہولت کے لیے اس کے حصے بخرے کر لیے ہیں۔ جو چیزیں طبیعت پر گراں گزریں ان میں حیلوں کی چابی لگا کر حلت و جواز کے لیے کہیں نہ کہیں سے کوئی راستے نکال لیے ۔ اور اب جو نتیجہ اس سے نکلا ہے آپ اس کے اوپر صرف لیبل بدل کر عوام کو یہ باور کرانا چاہیں کہ اسلام آ گیا ہے تو یہ اسلام کے ساتھ سب سے بڑی دشمنی ہو گی۔

ہر دور کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں‘ آج وہ تقاضے یکسر بدل چکے ہیں (کسی دَور میں استحسان اور مصالح مرسلہ کا کسی ایک طرف رُخ تھا تو آج دوسری طرف رُخ ہے) آج ضرورت ہے کہ اجتہاد کر کے اسلام کا پورا نظام جدید دَور کے تقاضوں کے مطابق اپنی کلیت (totality ) کے ساتھ لوگوں کے سامنے لایا جائے کہ یہ ہے اسلامی نظام۔ اگر نافذ کرنا ہے تو اس کو پورے کا پورا نافذ کرنا ہو گا اور اسی کی ایک حقیر سی کوشش میں نے اس وقت کی ہے۔

٭٭٭

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

سرمایہ اور محنت

محترم صدرِ مجلس اور معزز خواتین و حضرات! آج میں اس مجلس میں خطاب کرتے ہوئے کچھ دِقت سی محسوس کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ اگرچہ میں قرآن مجید کا ایک ادنیٰ طالب علم اور اسلام کا ایک ادنیٰ خادم ہوں اور اس اعتبار سے مجھے زندگی کے تمام مسائل کے بارے میں قرآن مجید کی راہنمائی پیش کرنے کا اہل ہونا چاہیے‘ تاہم یہ ٹیکنیکل مسئلہ کہ سرمایہ اور محنت کے درمیان توازن کیسے پیدا کیا جائے‘ واقعتا دَورِ جدید کے مشکل اور پیچیدہ ترین مسائل میں سے ہے‘ بلکہ اس کو اگر تقریباً لاینحل کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ اس میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اس امر سے کہ مجھے اس میدان میں کبھی کوئی عملی تجربہ نہیں ہوا۔ چنانچہ ایک طرف میں معروف معنی میں محنت کش بھی نہیں اور دوسری جانب سرمایہ دار تو کیا’سرمایہ کار‘ بھی نہیں ہوں‘ لہٰذا اس کوچے میں میری حیثیت عملی اعتبار سے بالکل نووارد کی سی ہے ۔اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محترم بہن صبیحہ شکیل صاحبہ اور محترم سردار صاحب نے میرے لیے مزید دِقت پیدا کر دی یہ فرما کر کہ وہ تو اس اجلاس میں اصلاً میری تقریر سننے کے لیے آئے ہیں۔ بعض دوسرے اصحاب نے بھی اصل راہنمائی کا بوجھ میرے کاندھوں پر ڈال کر میری ذمہ داری میں اضافہ کر دیا ہے۔ لہٰذا میں پوری کوشش کروں گا کہ اس موضوع پر دین کا جو بھی تھوڑا بہت فہم مجھے حاصل ہے اس کی روشنی میں ان مسائل کا ممکنہ حل آپ کے سامنے رکھوں۔ بیدہ التوفیق و علیہ التکلان!

آجر اور اجیر نہیں‘ آجر اور مستاجر

ہمارے ہاں بعض اصطلاحات بہت غلط استعمال ہوتی ہیں۔ آجر اور اجیر میں کوئی فرق نہیں بلکہ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں‘ یعنی اُجرت پر کام کرنے والا۔

\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_

(یہ مقالہ محکمہ محنت پنجاب کے مضامین سے انتخاب کیا گیا۔)

اُجرت پر کام کرانے والے کے لیے اصل اصطلاح ’’مستاجر‘‘ ہے۔ اسی قبیل کا ایک لفظ ’’متوفی‘‘ ہے جس کے اصل معنی ہیں وفات دینے والا ‘یعنی اللہ‘ نہ کہ جو فوت ہو رہا ہے ‘جس کے لیے اصل لفظ ’’مُتوفّٰی‘‘ ہے۔ ایسا ہی ایک لفظ ’’مغویہ‘‘ ہے جس کے معنی ہیں ’’اغوا کرنے والی‘‘ جبکہ اغوا کی جانے والی’’مغواۃ‘‘ ہے۔ تو مستاجر وہ شخص ہے جو کسی سے اُجرت پر کام لے رہا ہو اور آجر وہ شخص ہے جو اُجرت پر کسی کے ہاں کام کر رہا ہو۔

محنت یا عمل

چونکہ مقالے کا اصل موضوع ہے ’’اسلام میں محنت کا تصور‘‘ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لفظ محنت پر بھی کچھ عرض کر دیا جائے۔ یہ لفظ اگرچہ عربی زبان ہی کا ہے مگر نہ قرآن مجید میں اس معنی میں استعمال ہوا ہے‘ نہ حدیث نبویؐ میں‘ نہ ہی موجودہ فصیح عربی میں یہ اس معنی میں مستعمل ہے۔ قرآن و حدیث کی اصل اصطلاح ’’عَامِل‘‘ ہے۔ یعنی عمل کرنے والا یامحنت کرنے والا ۔پھر دوسرا لفظ وہی آجر یا اجیر استعمال ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں کمائی کا اصل تصور

اس موقع پر یہ وضاحت مناسب ہو گی کہ اس مسئلے پر ہمارے لیے قرآن مجید و حدیث میں بہت کم راہنمائی موجود ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید کی رُو سے انسان کی اصل ’’کمائی‘‘ نیکی یا بدی کی ہے‘ چنانچہ اس میں اصل زور ’’کسب خیر‘‘ کی ترغیب اور ’’کسب شر‘‘ سے اجتناب پر ہے‘ یعنی قرآن کا اصل زور (emphasis) معاش پر نہیں بلکہ ’’معاد‘‘ پر ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سوائے ایک آدھ استثنائی مثال کے ’’کسب‘‘ کا لفظ قرآن مجید میں رزق کے لیے استعمال ہی نہیں ہوا۔ الغرض از رُوئے قرآن انسان کی اصل کمائی وہ خیر و شر یا بھلائی یا برائی ہے جو وہ آخرت کے لیے کما رہا ہے‘ یہ اصل کسب ہے۔ اس کے برعکس رزق کے لیے قرآن مجید کی اصل اصطلاح ’’فضل‘‘ ہے ‘یعنی قرآن جو تصور دیتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو جوکچھ ملتا ہے وہ اس کی محنت کا حاصل یا صلہ نہیں بلکہ فضل خدا وندی ہے۔ قرآن کے نزدیک یہ قارونیت ہے کہ انسان اس مغالطے یا زعم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ جو دنیوی ساز و سامان یا مال و متاع اسے حاصل ہے وہ اس کا اپنا پیدا کردہ ہے‘ جیسے کہ قارون نے کہا تھا: {اِنَّمَاۤ اُوۡتِیۡتُہٗ عَلٰی عِلۡمٍ عِنۡدِیۡ ؕ} یعنی یہ سب کچھ تو مجھے اپنے علم کی وجہ سے حاصل ہوا ہے ۔گویا یہ میرے علم و فہم‘ میری ذہانت و فطانت‘ میری پیش بینی و پیش بندی‘ میری پلاننگ

اور دوراندیشی (foresight) کا نتیجہ ہے۔ قرآن مجید اس کی نفی کرتا ہے۔ اس کی تعلیمات کی رُو سے محنت انسان ضرور کرتا ہے ‘مگر جو کچھ اس کو ملتا ہے وہ سرا سر اللہ کا فضل ہے نہ کہ اس کی محنت کا حاصل یا صلہ۔ اسلام کے اخلاقی نظام کے لیے اصل بنیاد یہی تصور فراہم کرتا ہے ‘جبکہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کی اصل بنیاد ہے ’’قارونیت‘‘۔

محنت کا ذکر حدیث نبوی ﷺ میں

احادیث مبارکہ میں محنت یعنی مزدوری اور عمل یدیعنی انسان کے خود اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی بڑی عظمت و فضیلت وارد ہوئی ہے۔ مثلاً صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

((مَا بَعَثَ اللّٰہُ نَبِیًّا اِلاَّ رَعَی الْغَنَمَ)) فَقَالَ اَصْحَابُہٗ وَاَنْتَ؟ قَالَ: ((نَعَمْ، کُنْتُ اَرْعَاھَا عَلٰی قَرَارِیْطَ لِاَھْلِ مَکَّۃَ))

یعنی اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی مبعوث نہیں فرمایا جس نے اُجرت پر بھیڑیں نہ چرائی ہوں۔ صحابہ ؓ نے (متحیر ہو کر) سوال کیا: اللہ کے رسول ﷺ کیا آپ نے بھی یہ کام کیا ہے؟ اس کا جو جواب نبی اکرمﷺ نے ارشاد فرمایا وہ ہم سب کے لیے بہت اہم ہے‘ اس لیے کہ اس میں آنحضور ﷺ کا تواضع و انکسار بھی نمایاں طور پر جھلک رہا ہے:

’’میں تو چند قراریط کے عوض (چند ٹکوں کے عوض) مکہ کے لوگوں کے جانور چرایا کرتا تھا۔‘‘

معلوم ہوا کہ اجرت یا مزدوری پر دوسروں کے لیے کام کرنا ہر گز باعث ندامت یا موجب شرم نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگرچہ یہ تو مسلمات میں سے ہے کہ جو شخص خود اپنے سرمائے سے کام کر رہا ہو ‘خواہ وہ چھا بڑی ہی لگاتا ہو ‘اس کے لیے کسی احساسِ کمتری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جبکہ انسان کسی اور کے لیے اُجرت پر کام کرنے میں یقینا عار محسوس کرتا ہے ۔لیکن نبی اکرمﷺ نے اس کے لیے فرمایا کہ میں خود اجرت پر دُوسروں کے لیے کام کرتا رہا ہوں۔لہٰذا یہ قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ یہ ہر گز ایسی بات نہیں ہے جس پر انسان کسی بھی درجے میں ندامت یا شرم محسوس کرے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام بحیثیت اجیر

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اُجرت پر کام کرنے کا ثبوت قرآن مجید سے ملتا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام پورا صحرائے سینا پیدل عبور کر کے ’’ماءِ مدین‘‘

یعنی مدین کی بستی کے باہر کنویں پر پہنچے تو قرآن مجید نے ان کی اُس وقت کی بے چارگی اور دنیوی اعتبار سے بے وسیلہ ہونے کی کیفیت کا نقشہ کھینچنے کے لیے ان کی دعا کے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں: {رَبِّ اِنِّیۡ لِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ اِلَیَّ مِنۡ خَیۡرٍ فَقِیۡرٌ ﴿۲۴﴾} (القصص) ’’پرورد گار! جو خیر بھی تو میری جھولی میں ڈال دے میں اس کا محتاج ہوں‘‘۔ یعنی میری حالت اُس فقیر و مسکین کی ہے جسے ایک پیسہ بھی دیا جائے تو وہ اسے نہیں ٹھکراتا‘ بلکہ شکریے کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ تو یہ ہیں وہ الفاظ جو اللہ کے ایک جلیل القدر رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے نکلے۔ وہاں جب اللہ تعالیٰ نے یہ صورت پیدا فرما دی کہ شیخ مدین کی صاحبزادیوں نے ان کی جس جسمانی قوت اور اخلاقی عصمت و عفت کا بچشم سر مشاہدہ کیا تھا اس کی بنا پر انہوں نے اپنے والد سے سفارش کی: {یٰۤاَبَتِ اسۡتَاۡجِرۡہُ ۫ اِنَّ خَیۡرَ مَنِ اسۡتَاۡجَرۡتَ الۡقَوِیُّ الۡاَمِیۡنُ ﴿۲۶﴾} (القصص) یعنی ابا جان! اس شخص کو ملازم رکھ لیجیے‘ بہترین شخص جسے آپ اُجرت پر کام کرنے کے لیے رکھیں قوی بھی ہونا چاہیے اورامین بھی‘ اور یہ دونوں صفات اس میں موجود ہیں۔ اور شیخ مدین نے آگے بڑھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی ان دونوں بیٹیوں میں سے ایک کے نکاح کی پیشکش کر دی تو آٹھ یا دس برس کی مزدوری ان کا مہر قرار پایا ۔حضورﷺ کا ارشاد ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی عصمت و عفت کی حفاظت اور اپنا پیٹ بھرنے کے لیے آٹھ یا دس سال مسلسل مزدوری کی۔

((اِنَّ مُوْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامَ آجَرَ نَفْسَہٗ ثَمَانِیَ سِنِیْنَ اَوْ عَشْرًا عَلٰی عِفَّۃِ فَرْجِہٖ وَطَعَامِ بَطْنِہٖ)) (رواہ ابن ماجہ)

حضرت داؤد علیہ السلام اور عمل ید

اسی طرح صحیح بخاری ہی کی ایک اور حدیث کا حوالہ بھی یہاں بے محل نہ ہو گا۔ حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا:

((مَا اَکَلَ اَحَدٌطَعَامًا قَطُّ خَیْرًا مِّنْ اَنْ یَّاْ کُلَ مِنْ عَمَلِ یَدِہٖ‘ وَکَانَ نَبِیُّ اللّٰہِ دَاوٗدَ عَلَیْہِ السَّلَامَ یَاْکُلُ مِنْ عَمَلِ یَدِہٖ))

’’ کسی شخص نے اس سے بہتر روزی نہیں کھائی جس نے اپنے ہاتھ سے کام کر کے روزی کمائی ‘اور اللہ کے نبی داؤد ؑاپنے ہاتھ سے کام کر کے روزی کماتے تھے۔ ‘‘

ناصر الدین محمودؒ اور اورنگزیب عالمگیرؒ

یہی بات ہمیں اپنے ماضی قریب کی روایات میں بھی نظر آ جاتی ہے۔

ناصر الدین محمودؒ اور اورنگ زیب عالمگیرؒ جیسے بادشاہ اِسی برعظیم میں گزرے ہیں جنہوں نے شاہی خزانے سے کوئی استفادہ کرنے کی بجائے خود محنت کر کے اپنی گزرِ اوقات کا سامان مہیا کیا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ یہ باتیں سطحی نہیں ہیں بلکہ اپنے اندر گہرائی لیے ہوئے ہیں۔ اگر یہ باتیں ہماری فکر و سوچ میں سرایت کر جائیں تو ایک عظیم انقلاب واقع ہو جائے۔

اُجرت کی ادائیگی میں عجلت

اب آئیے اس موضوع پر دینی تعلیمات کے دوسرے جزو کی طرف‘ یعنی ان ہدایات کی جانب جو نبی کریم ﷺ نے محنت کشوں کے حقوق کے سلسلے میں دی ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو سنن ابن ماجہ کی وہ مشہور حدیث آتی ہے جس کے راوی حضرت عبد اللہ بن عمر و رضی اللہ عنہماہیں۔ یعنی:

((أَعْطُوا الْاَجِیْرَ اَجْرَہٗ قَبْلَ اَنْ یَّجِفَّ عَرَقُـہٗ ))

’’مزدور کو اس کی اجرت ادا کر دو اس سے پہلے کہ اس کا پسینہ خشک ہو۔‘‘

ماتحتوں کے ساتھ حسن سلوک

اور دوسری حد درجہ جامع حدیث وہ ہے جو ماتحتوں کے ساتھ حسن سلوک کے سلسلہ میں امام بخاری اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے حضرت معمور بن سوید رحمہ اللہ علیہ سے روایت کی ہے‘ جس میں اصل واقعہ تو حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کا بیان ہوا ہے ‘لیکن ضمناً نبی اکرم ﷺ کی مستقل اور دائمی ہدایات بھی نقل ہو گئی ہیں۔

حضرت معمور بن سوید بیان فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کو ان کے غلام کے ساتھ دیکھا کہ دونوں نے بالکل ایک ہی طرح کا حلہ پہن رکھا تھا۔ اس پر میں نے ان سے اس کے بارے میں پوچھا تو حضرت ابوذرؓ نے فرمایا کہ میں نے ایک مرتبہ اپنے غلام کو گالی دی تو اُس کی ماں کو برا بھلا کہا۔ اس پر رسول اللہﷺ نے سخت سرزنش کی اور ارشاد فرمایا: اے ابوذر! تم ایک ایسے شخص ہو جس میں ابھی جاہلیت کے آثار باقی ہیں۔ پھر فرمایا: ((اِخْوَانُکُمْ خَوَلُکُمْ جَعَلَھُمُ اللّٰہُ تَحْتَ اَیْدِیْکُمْ)) ’’یہ تمہارے ہی بھائی ہیں( انسان ہیں‘ آدم اور حوا کی نسل سے ہیں)‘ تمہارے خدمت گار ہیں‘ اللہ نے انہیں تمہارے ماتحت کر دیا ہے‘‘۔ اس کے بعد آپﷺ حکم دیتے ہیں:

((فَمَنْ کَانَ اَخُوْہُ تَحْتَ یَدِہٖ فَلْیُطْعِمْہُ مِمَّا

یَاْکُلُ وَلْـیُلْبِسْہُ مِمَّا یَلْبَسُ، وَلَا تُکَلِّفُوْھُمْ مَا یَغْلِبُھُمْ فَاِنْ کَلَّفْتُمُوْھُمْ فَاَعِیْنُوْھُمْ))

’’تو جس شخص کے ماتحت اللہ نے اُس کے کسی بھائی کوکر دیا ہو تو اسے چاہیے کہ جو کھانا وہ خود کھاتا ہے اسے بھی کھلائے اور جو لباس خود پہنتا ہے اسے بھی پہنائے۔ اور ان پر اتنا بار نہ ڈالو جس سے وہ دب کر رہ جائیں‘ اور اگر ایسی مشقت ڈالنی لازم ہی ہو جائے تو اس کام میں(خود بھی شریک ہو جاؤ اور ان کی مدد کرو۔‘‘

سوال کی مذمت اور محنت مزدوری کی ترغیب

یہاں نبی اکرم ﷺ نے جس طرح سوال کرنے کی بجائے محنت مزدوری کر کے پیٹ پالنے کی ترغیب دلائی ہے وہ بھی پیش نظر رہے۔ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے مروی روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَاَنْ یَاْخُذَ اَحَدُکُمْ اَحْبُـلَہٗ [فَیَاْتِیَ الْجَبَلَ] فَیَاْتِیَ بِحُزْمَۃِ الْحَطَبِ عَلٰی ظَھْرِہٖ فَیَبِیْعَہَا فَیَکُفَّ اللّٰہُ بِھَا وَجْہَہُ خَیْرٌ لَّــہٗ مِنْ اَنْ یَسْاَلَ النَّاسَ اَعْطَوْہُ اَوْ مَنَعُوْہُ)) (رواہ البخاری واحمد وابن ماجہ)

’’تم میں سے کسی شخص کا اپنی رسی لے کر پہاڑ پر چلے جانا اور پھر لکڑیوں کا گٹھا پیٹھ پر لاد کر بیچنا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا اس کے چہرے (یعنی عزتِ نفس) کو بچانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے سوال کرے ‘ وہ چاہیں تو اس کو کچھ دے دیں اور چاہیں تو خالی ہاتھ لوٹا دیں۔‘‘

تو یہ ہیں وہ اصول جو نبی اکرم ﷺ نے ماتحتوں کے بارے میں وضع فرمائے ہیں اور یہی ہیں وہ اخلاقی تعلیمات کہ جب تک وہ کسی معاشرے میں بالفعل موجود نہ ہوں تو محض کوئی خشک قانونی ڈھانچہ‘ خواہ اس کی کتنی ہی پیروی کیوں نہ کر لی جائے‘ معاشرے میں وہ برکات پیدا نہیں کر سکتا جو اسلام کی منشا ہیں اور جن کی ہم توقع رکھتے ہیں۔

اب میں اصل مسئلے کی طرف آتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے‘ کیونکہ ایک تو اس کا تعلق نظام اقتصادی کے ساتھ ہے اور دوسرے یہ کہ یہ کوئی الگ تھلگ مسئلہ نہیں ہے ‘بلکہ انسان اجتماعیات کے تمام پہلو یعنی سماجی‘ سیاسی اور معاشی مل کر ایک ناقابل تقسیم وحدت بنتے ہیں‘ ان میں سے کسی ایک کو علیحدہ کر کے اس پر غور نہیں کیا جاسکتا۔ ایک فلسفہ ٔزندگی اور نظریہ ٔحیات کی بنیاد پر جو نظامِ حیات وجود میں آئے گا اس کا اپنا ایک سماجی نظریہ ہو گا اور اسی کے ساتھ مناسبت رکھنے والا ایک معاشی

نظام وجود میں آئے گا اور اسی نوعیت کا سیاسی ڈھانچہ بھی ترتیب پائے گا اور سب مل کر ایک حیاتیاتی وحدت (organic whole) بن جائیں گے‘ لہٰذا ان میں سے کسی ایک جزو کو نکال کر اس کی کسی اور نظام کے ساتھ پیوند کاری نا ممکن العمل فعل ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں جو اصطلاحات مستعمل ہیں ‘مثلاً اسلامی جمہوریت اور اسلامی سوشلزم‘ ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاید اسلام کے ایمانیات‘ عبادات اور اخلاقیات لے کر دوسرے نظام ہائے زندگی کی عملی تشکیل کے مابین پیوند کاری کر سکتے ہیں۔ میرے نزدیک یہی اصل مغالطہ ہے۔ اسلام کی بنیاد اپنے ایک نظریے پر ہے جسے ہم ایمان کہتے ہیں۔ اس جڑ پر اگر تنا کھڑا ہو گا تو ا س سے نکلنے والی تمام شاخیں باہم مربوط ہوں گی۔ لیکن اگر وہ جڑ کمزور ہو یا اس جڑ کا بحیثیت جڑ سرے سے وجود ہی نہ ہو تو کسی بھی مصنوعی طریقے سے پیوند کاری کر کے اسلام کی برکات حاصل نہیں کی جا سکتیں۔

ایمان کیا ہے؟

اللہ اور اس کے رسولﷺ پر اس یقین کے ساتھ ایمان کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور جو راہ اس کے پیارے رسول ﷺ نے دکھائی اس پر چلے بغیر اس زندگی اور آخرت کی زندگی میں کامیابی نہیں ‘اور اس بات کا یقین کہ آخرت میں ہمارے عمل کا نیکی اور برائی کی صورت میں بدلہ ملے گا۔ یہ یقین ہی ایمان کی وہ بنیاد فراہم کرتا ہے کہ ہماری یہ دنیوی زندگی ہی حرفِ آخر نہیں بلکہ اصل زندگی تو موت کے بعد کی ہے اور انسان کا اصل مسئلہ بعد الموت زندگی سے متعلق ہے۔ رہی اس دنیا کی نا پائیدار زندگی تو یہ فانی ہے‘ عارضی ہے‘ اس کی کوئی حیثیت نہیں‘ اور اگر کچھ ہے بھی تو نہ ہونے کے برابر۔ ایمان کی یہ دو بنیادیں قرآن مجید کی اس ایک آیت میں سموئی ہوئی ہیں: {اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۱۵۶﴾ؕ} یعنی اللہ ہی ہمارا مبدأ و معاد ہے‘ ہم اُس کی طرف سے آئے ہیں اور اُسی کی طرف جانے والے ہیں۔گویا یہ ایک سفر ہے۔ جب فی الواقع ایمان کی یہ دو بنیادیں قائم ہو جائیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ : ((کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ)) (رواہ البخاری والترمذی) کے مصداق ایک ’’اجنبی‘‘ یا راہ چلتے مسافر کی طرح زندگی بسر کرنے کا سلیقہ آ جاتا ہے۔ راہ چلتے مسافر کو اس راہ گزر سے جس قدر دلچسپی ہوتی ہے مؤمن کو بھی اس دُنیا سے اتنی ہی دلچسپی ہوتی ہے۔

اسلامی نظام کا وجود

اس وقت دنیا میں بالفعل تو دو ہی نظام ہائے معیشت موجود ہیں ‘یعنی سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت ۔رہا اسلام کا نظامِ معیشت تو وہ دنیا کی ایک اِنچ زمین پر بھی بالفعل قائم نہیں ہے‘ اس کا وجود تو صرف ہمارے ذہنوں میں ہے یا ہماری زبانوں کی نوک پر یا اسی قبیل کی چیز ہے قلم جس تک یہ تصور محدود ہے۔

اسلام بمقابلہ اشتراکیت و سرمایہ داریت

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ اگرچہ اشتراکیت (Communism ) اور سرمایہ داریت (Capitalism) دونوں بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں‘ ایک مشرق ہے تو دوسرا مغرب‘ لیکن اسلام کے مقابلے میں ان دونوں میں ایک قدر مشترک ہے۔ یہ آپس میں تو متضاد اور مقابل ہیں لیکن اسلام کے مقابلے میں اپنے فکری پس منظر کے ساتھ ایک ہی تنے کی دو شاخیں ہیں۔ اسلام جہاں مادّیت کے مقابلے میں رُوحانیت اور اس دنیوی زندگی کے مقابلے میں آخرت کی دعوت دیتا ہے یہ دونوں نظام صرف اور صرف مادہ پرستی کی بنیاد پر قائم ہیں۔ یہ فلسفہ ٔمادّیت ہی تھا جس نے ایک قدم آگے بڑھا کر جدلی مادّیت (Dialectical Materialism) کی شکل اختیار کر لی اور کمیونزم وجودمیں آیا۔

اسلام کا معاملہ ان دونوں سے مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنی ہی قائم کردہ بنیادوں پر اپنے مکمل ڈھانچے میں قائم ہو سکتا ہے اور کسی قسم کی پیوند کاری قبول نہیں کرتا۔ لہٰذا جب تک وہ نظریاتی بنیاد استوار نہ ہو اسلامی نظام کے ڈھانچے کا خیال گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنے کے مترادف ہو گا۔ پہلے نظریاتی بنیاد کا استحکام ضروری ہے‘ اس لیے کہ اسلام تو ’’ایمان‘‘ ہی کی بنیاد پر قائم ہو گا۔ اس کے علاوہ کسی اور جڑ یا بنیاد پر اس کے قیام کا تصور ہی بے کار ہے۔

اسلام میں عدل و قسط کی اہمیت

اسلام کی متذکرہ بالا اساس یعنی ایمان کو استوار کرنے کے ساتھ ساتھ اِس بات سے انکار بھی ممکن نہیں ہے کہ اسلام نے عدل و قسط کے قیام کو بھی بنیادی اہمیت دی ہے۔ شریعت‘ انزالِ کتب اور بعثت رُسل کا مقصد‘ نیز دین کا پورا ڈھانچہ

ان سب کا مرکزی خیال قیامِ عدل و قسط ہے ‘یعنی عدل و انصاف پر مبنی ایک نظامِ حیات کا قیام گویا اسلام و ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔

چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ’’قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ‘‘ (انصاف کا قائم کرنے والا) بھی آئی ہے۔ اس کے علاوہ ارشادِ خداوندی ہے:

{یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُہَدَآءَ لِلّٰہِ} (النسائ:۱۳۵)

’’اے ایمان والو! عدل اور قسط کے قائم کرنے والے اور اللہ کے گواہ بنو۔ ‘‘

{یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ لِلّٰہِ شُہَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ ۫} (المائدۃ:۸)

’’اے اہل ایمان! اللہ کی خاطر راستی پر قائم ہونے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ ‘‘

یہ ایک ہی بات کو دو پیرایوںمیں بیان کیا گیا ہے ‘لیکن اس خوب صورت انداز میں کہ رُوح وجد کرنے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ فرمایا:

{لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ } (الحدید:۲۵)

’’ہم نے بھیجے اپنے رسول بینات دے کر اور ہم نے اتاری ان کے ساتھ کتاب اور میزان تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں۔ ‘‘

{وَ قُلۡ اٰمَنۡتُ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنۡ کِتٰبٍ ۚ وَ اُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَیۡنَکُمۡ ؕ} (الشوریٰ:۱۵)

’’اور کہو: میں ایمان رکھتا ہوں اس پر جو اللہ نے مجھ پر اُتارا ‘اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے مابین عدل کروں۔ ‘‘

چنانچہ فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے جب ایرانیوں نے پوچھا کہ آپ ہم پر کیوں حملہ آور ہوئے تو آپ نے جواباً فرمایا:

اِنَّا قد اُرسلنا لنخرج الناس من ظلمات الجہالۃ الی نُورِ الایمان ومن جور الملوک الی عدل الاسلام

’’ہمیں بھیجا گیا ہے کہ ہم لوگوں کو جہالت کے اندھیروں سے نورِ ایمان کی طرف نکالیں اور شہنشاہی استبداد سے نجات دلا کر عدلِ اسلام سے روشناس کرائیں۔ ‘‘

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیعت خلافت کے بعد جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ اسلامی مملکت کے اصول متعین کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا: ’’تم میں سے ہر قوی میرے نزدیک ضعیف ہے جب تک اس سے حق وصول نہ کر لوں اور تم میں سے ہر

ضعیف میرے نزدیک قوی ہے جب تک اس کا حق نہ دِلوا دوں‘‘۔ گویا نظامِ عدل و قسط کا قیام‘ اسلامی ریاست کا بنیادی مقصد ہے۔

امتیازی سلوگن

ہر نظام میں کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے مفہوم کے اعتبار سے اس نظام کا امتیازی سلوگن (slogan) بن جاتے ہیں۔ Capitalism میں آزادی (freedom) کی تکرار ملے گی۔ یہ گویا ان کے فکر کی بنیاد اور مرکز و محور ہے۔ اسی طرح اشتراکیت (Socialism) میں مساوات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں نوعِ انسانی کے لیے کشش ہے۔ اس مرحلے پر یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ دونوں اعلیٰ قدریں ہیں۔ آزادی بھی ایک اعلیٰ قدر ہے اور مساوات بھی ۔ان کے مقابلے میں اسلام نے‘ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے‘عدل کا تصور دیا ہے‘ وہ آزادی اور مساوات کے درمیان بھی عدل کا راستہ تجویز کرتا ہے۔ نہ تو آزادی اس قدر بڑھ جائے کہ مساوات کو ہڑپ کر جائے اور نہ مساوات کا ہوا کھڑا ہو کر آزادی جیسی اعلیٰ اقدار سے انسانی معاشرہ کو محروم کر دے۔ ’’آزادی کی قیمت پر مساوات اور مساوات کی قیمت پر آزادی‘‘ اسلام ان دونوں کے حق میں نہیں ہے۔ اسلام عدل چاہتا ہے اور یہی وہ لفظ ہے جس کو اسلام کا امتیازی slogan قرار دیا گیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دُنیا میں نظامِ عدل کے قیام کی غرض آخر کیا ہے؟ اس طرف انسانی اجتماعیات کے بہت بڑے عالم حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ علیہ نے توجہ دلائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

’’قرآن حکیم کی واضح تعلیمات کے مطابق مسلم معاشرے کو حکم دیا گیا ہے کہ نہ اسراف کیا جائے نہ تبذیر‘ بلکہ راہِ اعتدال اختیار کی جائے۔ اسراف کا مطلب ہے حد سے زیادہ خرچ کرنا اور تبذیر سے مراد ہے بے جا اور فضول خرچ کرنا۔‘‘

(۱) {وَّ کُلُوۡا وَ اشۡرَبُوۡا وَ لَا تُسۡرِفُوۡا ۚ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الۡمُسۡرِفِیۡنَ ﴿٪۳۱﴾} (الاعراف)

’’اور کھاؤ پیو لیکن اسراف نہ کرو ‘بے شک وہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ ‘‘

(۲) {اِنَّ الۡمُبَذِّرِیۡنَ کَانُوۡۤا اِخۡوَانَ الشَّیٰطِیۡنِ ؕ وَ کَانَ الشَّیۡطٰنُ لِرَبِّہٖ کَفُوۡرًا ﴿۲۷﴾} (بنی اسراء یل)

’’اور بے جا خرچ نہ کرو‘ بیشک بے جا خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔ ‘‘

(۳) {وَ لَا تَجۡعَلۡ یَدَکَ مَغۡلُوۡلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ وَ لَا تَبۡسُطۡہَا کُلَّ الۡبَسۡطِ فَتَقۡعُدَ مَلُوۡمًا مَّحۡسُوۡرًا ﴿۲۹﴾} (بنی اسراء یل )

’’اور اپنے ہاتھ کو اپنی گردن کے ساتھ باندھ کر نہ رکھ اور نہ اسے بالکل ہی کھول دے‘ ورنہ تو بیٹھ رہے گا الزام کھایا ہارا ہوا۔‘‘

(۴) {وَ الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَنۡفَقُوۡا لَمۡ یُسۡرِفُوۡا وَ لَمۡ یَقۡتُرُوۡا وَ کَانَ بَیۡنَ ذٰلِکَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾} (الفرقان)

’’اور(رحمن کے بندے) وہ لوگ ہیں جو خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے اور نہ تنگی کرتے ہیں‘ بلکہ(ان کا خرچ) ان دونوں کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔ ‘‘

معاشرے کے تین معروف معیارات

عموماً معاشرے میں تین قسم کے معیارِ زندگی پائے جاتے ہیں:

ا : رفاہیت بالغہ ‘یعنی عیاشانہ معیارِ زندگی ‘جس میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی چیز پسند کی جاتی ہے۔ اس طرح حد سے زیادہ بلکہ بے جا خرچ کیا جاتا ہے اور دولت کو ضائع کیا جاتا ہے۔

ب: رفاہیت ناقصہ‘ یعنی پست معیارِ زندگی‘ جس میں زندگی کی ضروریات بھی پوری طرح حاصل نہیں ہوتیں اور جانوروں کی سی زندگی بسر کی جاتی ہے۔

ج: رفاہیت متوسطہ‘ یعنی درمیانہ معیارِ زندگی‘ جس میں زندگی کی ضروریات متوسط درجے میں حاصل ہوتی ہیں اور انسان اتنی فراغت پاتا ہے کہ وہ اپنی اور دوسروں کی بھلائی کے لیے بھی کوئی کام کر سکے اور خدا کو بھی یاد کر سکے۔

اللہ تعالیٰ نے رفاہیت بالغہ یعنی عیاشی کو نا پسند فرمایا ہے اور ایسی معاشرت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے جس سے انسان دنیا کی طلب کے اندر ہی الجھ کر رہ جائے اور معیشت کی باریکیوں میں اُتر جائے اور اس کے اندر انتہائی تعمق اور غلو کرنے لگے۔ چنانچہ ریشم‘ سونے چاندی کے برتن اور بھاری زیورات مثلاً کنگن‘ گلوبند‘ ہار‘ طوق‘ پازیب وغیرہ کا استعمال اللہ تعالیٰ کو سخت نا پسند ہیں‘ کیونکہ یہ چیزیں انسان کو ’’اسفل سافلین‘‘ میں پہنچا دیتی ہیں اور انسانی افکار کو مختلف قسم کی باریکیوں میں الجھا دیتی ہیں۔ رفاہیت کی اصل حقیقت یہ ہے کہ معاشرتی زندگی میں اچھی چیزیں طلب کی جائیں اور ادنیٰ سے اعراض کیا جائے۔ لیکن رفاہیت بالغہ یہ ہے کہ ایک ہی چیز میں سے سب سے اعلیٰ کا انتخاب کیا جائے۔

رفاہیت ناقصہ عموماً ان لوگوں کا معیارِ زندگی ہوتا ہے جو آبادیوں سے دُور پہاڑی

علاقوں میں رہتے ہیں اور ان کا حال وحشی جانوروں کا سا ہوتا ہے۔ شہروں کے وہ لوگ بھی اس ذیل میں آتے ہیں جو دوسروں کی خاطر محنت کرتے ہیںمگر انہیں پورا معاوضہ نہیں ملتا۔ پھر ان پر طرح طرح کے ٹیکس لگا دیے جاتے ہیں جن سے ان کی حالت گدھوں اور بیلوں کی ہو جاتی ہے جس سے سخت کام لیا جاتا ہے اور محض زندہ رہنے کے لیے کچھ کھانے کو دے دیا جاتا ہے۔ پھر ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ محنت و مشقت سے فرصت ہی نہیں پاتے اور نہ وہ سعادتِ اُخرویہ کی طرف متوجہ ہو پاتے ہیں بلکہ ان میں سعادتِ اُخرویہ کا احساس ہی فنا ہو جاتا ہے ‘اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملک بھر میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں رہتا جو دین کے مطابق کوئی حرکت کر سکے۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

اگر اس طریقے سے انسان جکڑے ہوئے ہوں جس طرح بنی اسرائیل کو فرعونیوں نے جکڑا ہوا تھا کہ صبح سے لے کر شام تک ان سے بیگار لی جا رہی ہے‘ کسی اور بات یا اعلیٰ قدر کی طرف متوجہ ہونے کی انہیں فرصت ہی نہیں ہے۔ اس طرح اگر کسی انسانی معاشرے میں معاشی نا ہمواری کی یہ کیفیت ہو جائے کہ لوگوں کی اکثریت صرف دال روٹی کے حصول میں سرگرداں ہو۔ معاملہ جب یہ ہو جائے کہ انسان بنیادی ضروریات کی فراہمی کے لیے کمر توڑ دینے والی محنت کرے اور پھر بھی اس کی ضروریات پوری نہ ہو ں تو انسان کا حیوانی سطح پر آ جانا کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔ اس لیے اسلام نظامِ عدل و قسط قائم کرنا چاہتا ہے‘ نہ صرف قانونی نظام بلکہ سماجی عدل بھی‘ تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ اللہ کی معرفت حاصل کریں۔ اس سے لو لگائیں‘ اس سے محبت کریں اور اپنے مقصد ِتخلیق کو پورا کریں ۔اور یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ انہیں اس کے لیے فرصت ہو‘ وقت ملے اور یہ نہ کہہ سکیں کہ :

؏ تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے!

اسلام کے معاشی نظام کے دو رُخ

اسلام کس قسم کا معاشی اور اقتصادی نظام قائم کرنا چاہتا ہے؟ اس کی وضاحت سے قبل اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ اسلام کے معاشی

نظام کے دو رُخ یا دو پہلو ہیں یا یوں سمجھئے کہ دو حصے ہیں ‘مگر اس طرح کہ دونوں اپنی اپنی جگہ ایک مکمل نظام کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ دونوں کا اپنا ایک فلسفہ ہے‘ اپنا نظریہ ٔ ملکیت اور نظریہ ٔحقوق ہے اور اسی طرح دونوں کا اپنا نظریۂ قدرِ زائد ہے۔ معاشی نظام میں اہمیت رکھنے والی تمام چیزیں ان دونوں نظاموں میں جدا جدا ہیں اور اپنا جداگانہ فلسفہ رکھتی ہیں۔ سورۃ الرحمن کی آیۂ مبارکہ

{مَرَجَ الۡبَحۡرَیۡنِ یَلۡتَقِیٰنِ ﴿ۙ۱۹﴾بَیۡنَہُمَا بَرۡزَخٌ لَّا یَبۡغِیٰنِ ﴿ۚ۲۰﴾}

’’اُس نے دو دریا جاری کیے جو برابر چل رہے ہیں‘ مگر ان کے درمیان ایک غیرمرئی پردہ حائل ہے جو انہیں باہم مدغم نہیں ہونے دیتا۔ ‘‘

کے مصداق اسی شکل میں یہ دونوں نظام موجود ہیں اور اسلام جو مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے وہ ان دونوں کے حسین امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔

خلط مبحث

ہمارے ہاں خلط مبحث ہوتا ہے اور ہر شخص اپنے نقطئہ نظر کے مطابق اسلام کے معاشی نظام کی تشریح و تعبیر کرتا ہے۔ جو لوگ سوشلزم اور کمیونزم سے متاثر ہیں وہ انفرادی ملکیت کی کامل نفی کرتے ہیں۔ ضرورت سے زائد ہر چیز چھین لینے کی بات کرتے ہیں اور دوسرا پہلو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں‘ مثلاً قانونِ وراثت بھی تو قرآن مجید میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ حضور اکرم ﷺ کے قائم کردہ نظام میں بھی جبری مساوات کی نفی کردی گئی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ جائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت پر تصرف کا حق ہے‘ بلکہ وراثتاً جائیداد کی منتقلی کا حق بھی تسلیم کیا گیا ہے۔

دوسری طرف وہ لوگ جو کمیونزم سے خار کھاتے ہیں وہ اسلام کے قانونی نظام کا تو دم بھرتے ہیں ‘جبکہ اس کے رُوحانی نظام کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ انفرادی ملکیت کو اس قدرنمایاں کرتے ہیں کہ ایک استحصالی سرمایہ دارانہ نظام کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل

یہ دونوں قسم کے نقطہ ہائے نظر کسی غلط فہمی کی بنیاد پر بھی پیدا ہو سکتے ہیں اور خلوصِ نیت کے ساتھ بھی۔ اسلام کے قرنِ اول میں بھی یہ غلط فہمی پیدا ہوئی،

چنانچہ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ نے جن پر زہد اور فقر کا غلبہ تھا ’’آیۂ کنز‘‘ (۱) کو ظاہری معنوں پر محمول کیا اور اس رائے کا اظہار کیا کہ سونا چاندی اور سرمایہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنے پاس رکھنا حرام ہے۔ اس سے ایک بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ خلافت راشدہ نے ان کی اس رائے کو انتہاپسندانہ قرار دیا۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دَور میں انہیں مدینہ بدر کیا گیا اور مدینہ سے باہر ہی ان کا انتقال ہوا۔ انتقال کے وقت صرف ان کی اہلیہ محترمہ ان کے پاس تھیں۔ ان کے زہد کی شدت کا یہ عالم تھا کہگھر میں ضرورت کی چند چیزیں تھیں ‘مگر ان کی موجودگی پر بھی پریشان تھے اور بار بار کہتے تھے: ’’حضورﷺ نے فرمایا تھا کہ تم اپنے گرد سانپ اور بچھو جمع کر لو گے اور یہ مجھے نظر آ رہے ہیں‘‘۔ اہلیہ محترمہ نے کہا: ’’کہاں ہیں وہ سانپ اور بچھو جو ہم نے جمع کر لیے ہیں؟‘‘ تو فرمانے لگے: ’’یہ دیکھو توا ہے‘ چمٹا ہے‘ دیگچی ہے‘ پہننے کے کپڑے ہیں‘ اور یہ سب سانپ اور بچھو ہی تو ہیں۔‘‘

یہ صحیح ہے کہ اسلام قانونی نظام سے رُوحانی نظام کی طرف قدم بڑھانے کا تقاضاکرتا ہے‘ وہ چاہتا ہے کہ انسان اس کی طرف پیش قدمی کرے اور اسی بات سے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کو کامل خلوص کے ساتھ مغالطہ لا حق ہوا‘ لیکن بد نیتی کے ساتھ بھی یہ غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اخلاقی و رُوحانی نظام کے اصول

اسلام کے اخلاقی یا روحانی نظام کے چار اصول ہیں:

(۱) ملکیت کی کلی نفی۔

(۲) انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ اُس کا کسب نہیں بلکہ اللہ کا فضل ہے‘ اُس کی عطا ہے۔

(۳) انسان کا حق اُس کی جائز ضروریات ہیں۔ بعض احادیث میں حضور اکرمﷺ نے انہیں متعین فرما دیا ہے ‘یعنی دو وقت کے کھانے کے لیے سامان ‘سر چھپانے کو چھت‘ دو جوڑے کپڑے اور عفت و عصمت کی حفاظت کے لیے بیوی۔

(۴) اب جو کچھ انسان کے پاس بچ رہے اسے دوسروں کی ضروریات کے لیے وقف کردے ۔ اگرچہ قانونی طور پر اسے اس پر حق تصرف حاصل ہے ‘لیکن اخلاقی تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسروں کی طرف منتقل ہو۔

\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_

(۱) {وَ الَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّہَبَ وَ الۡفِضَّۃَ وَ لَا یُنۡفِقُوۡنَہَا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۙ فَبَشِّرۡہُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿ۙ۳۴﴾} (التوبۃ)

تو یہ اپنے طور پر ایک مکمل نظام ہے۔ اس میں نظریہ ٔملکیت بھی ہے اور اپنے حق کا تصرف بھی۔ نیز اگر قدرِ زائد ہے تو اس کا مصرف بھی موجود ہے۔

اخلاقی نظام میں ربا

قرآن مجید میں ربا کا لفظ دو چیزوں کے ضد کے طور پر آیا ہے:

(۱) ربا بمقابلہ بیع : {وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الۡبَیۡعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ } (البقرۃ:۲۷۵)

(۲) ربا بمقابلہ صدقات اور تزکیہ ٔنفس کے واسطے خرچ کرنے کے‘ جیسے {وَ مَاۤ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ زَکٰوۃٍ تُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُضۡعِفُوۡنَ ﴿۳۹﴾} (الروم)

اسلام کی رُوحانی تعلیمات میں اسی مفہوم کے ساتھ سورۃ البقرۃ کی اس آیت --- {یَمۡحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَ یُرۡبِی الصَّدَقٰتِ ؕ} (آیت ۲۷۶) ’’ اللہ ربا کو گھٹاتا اور صدقات کو بڑھاتاہے‘‘---میں صدقات کے مقابلے میں ربا کا لفظ آیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ ایک انسان یا مثلاً ملازم پیشہ آدمی کی ضرورت پوری ہونے کے بعد کچھ سرمایہ اُس کے پاس جمع ہو گیا ہے۔ اب اس فاضل سرمائے کے دو مصرف ہیں‘ یا تو وہ اسے کسی کاروبار میں لگائے۔ اس صورت میں اس کی محنت اس میں شامل نہیں ہو گی۔ اب اس اخلاقی نظام میں فاضل سرمائے سے جو بڑہوتری ہو گی وہ بھی ایک طرح سے ربا قرار پائے گی۔ اس کا صحیح مصرف یہ ہے کہ اسے محتاجوں اور مسکینوںمیں تقسیم کر دیا جائے یا وہ لوگ جن کے پاس کاروبار کی بنیاد ڈالنے کے لیے سرمایہ موجود نہیں انہیں سرمایہ فراہم کیا جائے تاکہ وہ رزقِ حلال با عزت طریقے سے حاصل کرنے کے قابل ہو سکیں۔ ان کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ان کی محنت میں سے حصہ وصول کرنا گو قانونی طور پر جائز بھی ہو‘ اخلاقی اور رُوحانی سطح پر یہ ممنوعات کی فہرست میں شامل ہو گا۔ اس لیے اس فاضل سرمائے کا مصرف یہ ہونا چاہیے کہ ضرورت مند اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اور اگر زیادہ نہیں تو انہیں یہ سرمایہ بطورِ قرضِ حسنہ ہی دے دیا جائے تاکہ وہ بھی اپنے پائوں پر کھڑے ہوں اور معاشرے میں صاحب عزت اور صاحب حیثیت بن سکیں۔ قرآن کی اخلاقی اور روحانی تعلیم کا یہی وہ نکتہ ہے جسے اپنا کر ایک جنتی معاشرہ تشکیل دیا جا سکتا ہے۔

عفو اور قصاص

اسلام کے اخلاقی اور رُوحانی نظام کا فرق و تفاوت بلکہ بعض اوقات تضاد صرف معاشی تعلیمات ہی میں نہیں بلکہ دوسرے قوانین میں بھی ہے۔ مثلاً مظلوم بدلہ لینے کا قانونی حق رکھنے کے باوجود معاف کر

سکتا ہے اور اخلاق اور رُوحانیت کا تقاضا عفو ودر گزر ہی ہے (۱) جبکہ قانون قصاص لینے ہی میں خیر محسوس کرتا ہے اور اسی کی ترغیب دلاتا ہے۔ (۲)

قانونی اور فقہی نظام

اس کے بعد آئیے اسلام کی قانونی معاشی تعلیمات کی طرف اور ان کے ضمن میں سمجھئے اسلام میں محنت کے تصور کو۔ اسلام کا قانونی معاشی نظام ایک طرح کا Controlled Capitalism ہے کہ اس میں تینوں جبلی تقاضے موجود ہیں۔ اس میں نجی ملکیت (private ownership) بھی ہے اور ذاتی دلچسپی بھی‘ اور ساتھ ہی ساتھ آزاد معیشت کا تصور بھی۔ البتہ اس میں حلال اور حرام کی تفریق موجود ہے۔ پابندی کمانے پر نہیں بلکہ حلال سے تجاوز کرنے پر ہے۔ ملکی قانون حق تصرف تسلیم کرتا ہے اور اپنی مرضی سے اللہ کی راہ میں دینے کا تقاضا بھی کرتا ہے۔ البتہ جو فرض ہے مثلاً زکوٰۃ وہ جبراً وصول کر لی جائے گی‘ لیکن زکوٰۃ کے علاوہ اس پر کوئی قانونی پابندی نہیں ہو گی۔ مگر ذہن میں رہے کہ اسلام نے اس قانونی نظام کو دو پہلوئوں سے حدود کا پابند کیا ہے تاکہ یہ ایک لعنت بن کر نوعِ انسانی پر مسلط نہ ہو جائے۔ ایک تو وہ خطوط متعین کیے گئے جن کی موجودگی میں سرمایہ کاری سرمایہ داری بننے سے محفوظ رہے۔ دوسری طرف آزاد معیشت میں بعض لوگوں کے آگے بڑھ جانے اور بعض لوگوں کے پیچھے رہ جانے کے امکان کو تسلیم کر کے جبری مساوات کی بجائے اس فرق و تفاوت کو بڑی حد تک ختم کرنے اور اس درمیانی خلا کو پر کرنے کے لیے راستہ تجویز کیا گیا۔ نظامِ زکوٰۃ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اسلام نے ایک حد ِفاصل قائم کر دی ہے کہ جو بھی اس حد سے آگے بڑھ جائیں وہ مال دار ہیں اور دینے کے مکلف ہیں اور جو اس حد تک نہیں پہنچ سکے وہ مستحق اور ضرورت مند ہیں۔ معروف معنوں میں پہلے والوں کو haves اور دوسروں کو have nots شمار کرلیجیے۔ لیکن یہ تقسیم آپ کے اختیارات کے تابع نہیں کہ آپ جسے چاہیں have اور جسے چاہیں have not بنا دیں‘ بلکہ نصاب کی ایک حد مقرر کر دی گئی ہے کہ اتنے اونٹ یا اتنا سونا وغیرہ ہے تو دینے والوں کی صف میں اور اگر اس سے کم ہے تو لینے والوں کی صف میں۔ اس تقسیم کے بعد یہ

\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_

(۱) {وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌN} (التغابن)

(۲) {وَلَـکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰـاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَW} (البقرۃ)

اصول قائم کر دیا گیا:

’’تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِیَائِ ھِمْ وَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَائِ ھِمْ‘‘ یعنی اغنیاء سے لے کر مستحقین میں تقسیم کی جائے گی تاکہ اس تفریق کا کسی حد تک خاتمہ کیا جا سکے جو معاشرے میں پیدا ہو کر بہت سی برائیوں کا باعث بنے گی۔

ارتکازِ دولت

لیکن ایسا نہیں ہو گا کہ کچھ لوگ تو ارتکازِ دولت کر کے عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں اور کچھ لوگ ضروریاتِ زندگی سے بھی محروم رہ جائیں۔ اسلام اجتماع و ارتکازِ دولت کا مخالف ہے‘ سرمائے کو گردش میں لانے کا متقاضی ہے ‘لیکن وہ سرمائے کی فطری گردش کے حق میں ہے۔ سرمائے کی مصنوعی گردش جو سرمایہ دارانہ نظام کا خاصہ ہے‘ اسلام کے نزدیک پسندیدہ نہیں۔ اس نے اصولاً یہ بات طے کر دی:

{کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ ؕ } (الحشر)

’’تاکہ دولت تم میں سے سرمایہ داروں کے مابین ہی اُلٹ پھیر میں نہ رہ جائے۔ ‘‘

جیسے ایک کروڑ پتی کی بیٹی ایک دوسرے کروڑ پتی کے بیٹے سے بیاہی گئی‘ لاکھوں کا جہیز اس گھر میں جمع ہو گیا جہاں کروڑوں روپے پہلے سے موجود ہیں۔ سرمایہ تو گردش میں آیا مگر مصنوعی انداز میں اور معاشرے کو اس سے قطعاً کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور یہ سرمایہ نچلے طبقات تک منتقل نہیں ہو سکا۔ اسی طرح ایک سرمایہ دار کے بیٹے کی سالگرہ پر لاکھوں روپے کے تحائف جمع ہو گئے۔ سرمایہ کی گردش کا عمل یہاں بھی وقوع پذیر ہوا لیکن بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ (سرمایہ داروں کے درمیان)۔ اسلام کی منشا یہ ہے کہ معاشرے میں جو بھی ذرائع پیداوار ہیں(اور زمین سب سے بڑا ذریعہ پیدا وار ہے) ان کی منصفانہ تقسیم ہو اور ان کا حاصل پورے معاشرے میں پھیلے۔ میں نے Controlled Capitalism کی جو اصطلاح استعمال کی ہے اب اسے Internally managed Capitalism کے الفاظ میں ادا کیا جا رہا ہے ‘کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام بھی یہ بات جان چکا ہے کہ ننگی اور عریاں سرمایہ داریت اس دَور میں نہیں چل سکتی۔ اس کا کوئی مستقبل نہیں ‘بلکہ وہ تو تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔ بقول علامہ اقبا ل ؎

**دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے**

**کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا**

**تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی**

**جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا**

کفالت ِعامہ

سرمایہ دارانہ نظام کلی طور پر اپنے فلسفے کے ساتھ اب قابل قبول نہیں رہا۔ اس کا کوئی مستقبل نہیں اور وہ تباہی کے کنارے تک پہنچ چکا ہے۔ اس لیے اپنے تحفظ کے لیے قابل عمل اقدامات کر رہا ہے‘ جس کی نمایاں مثال برطانوی معاشرہ میں ملتی ہے۔ وہاں ان لوگوں کے لیے جو کام نہیں کر پاتے روزگار نہ ہونے کی صورت میں الائونس مقرر دیے گئے ہیں۔ اس طرح بنیادی ضروریات کی کفالت ریاست اپنے ذمے لے لیتی ہے‘ آزاد معیشت کا تصور بھی مجروح نہیں ہوتا اور ضرورت مند لوگوں کی کفالت کا سامان بھی کردیا جاتا ہے‘ لیکن غور کیا جائے تو اسلام کے نظامِ معیشت میں یہ اصول چودہ سو سال پہلے طے کیا جا چکا ہے ‘جہاں سرمایہ دارانہ نظام یا بے خدا معاشرہ ٹھوکریں کھا کر اب پہنچ رہا ہے۔ اسلام چودہ سو سال پہلے یہ بتا چکا ہے کہ کمانے کھانے کی آزادی ہے اور آگے بڑھنے کی بھی‘ لیکن جو پیچھے رہ جائیں ان کی بنیادی ضروریات کی فراہمی معاشرے کا فرض ہے اور زکوٰۃ و عشر کا نظام اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

کفالت عامہ کے اصول کو Collective Insurance بھی کہا جا سکتا ہے‘ اس فرق کے ساتھ کہ انشورنس خواہ کسی قسم کی ہو اسے انسان اپنی کمائی میں بچت کر کے حاصل کرتا ہے ‘لیکن اسلام نے جو اصول وضع کیا ہے اس میں ایک طبقہ بچاتا ہے اور جمع کرتا ہے‘ لیکن ضروری نہیں کہ اس کا فائدہ بھی اُسے ہی پہنچے جس نے بچایا اور جمع کیا ہے‘ بلکہ ایک مال دار اور غنی ہے جو بچاتا اور جمع کرتا ہے اور دوسرا طبقہ جو ضرورت مند ہے اس سے اپنی ضرورت پوری کرتا ہے اور اس کی یہ کفالت نظامِ زکوٰۃ اور عشر کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ اب آئیے اسلام کے فقہی اور قانونی نظام میں کمائی میں حلال و حرام کی قیود کی طرف۔

حلال و حرام کی حدود

اسلام پہلی شرط حلال و حرام کی پا سداری کی عائد کرتا ہے تاکہ معاشرے میں یہ تمیز اٹھ جانے کے بعد جو طوفانِ بد تمیزی برپا ہوتا ہے اور انسانیت کی حیوانیت میں تبدیلی کا عمل شروع ہوتا ہے اس کا سد باب کیا جا سکے۔ اس کے بعد ان اقدامات پر نظر ڈالیے جو قرآن مجید اپنے معاشی نظام میں وضع کرتا ہے اور عش عش کیجیے۔ لیکن یہ وضاحت بہرحال ضروری ہے کہ قرآن مجید معاشیات کی کتاب نہیں ہے کہ اس نے عنوانات قائم کر کے معاشی اصطلاحات پر بحث کی ہو اور ایک ایک نکتے کی وضاحت ضروری سمجھی گئی ہو۔ تاہم کتاب ہدایت ہونے کی بنا پر قرآن مجید میں زندگی کے اس پہلو میں بھی رہنمائی کی گئی ہے۔ قرآن مجید نے جو ہدایات دی ہیں ان سب کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ اسلام اپنے قانونی نظام میں بھی زیادہ سے زیادہ محنت پر انحصار کرتا اور سرمایہ کو کم از کم اہمیت دیتا ہے۔ محنت اور سرمائے کے امتزاج سے معاشی ڈھانچہ کی تشکیل کو وہ تسلیم کرتا ہے‘ لیکن محض سرمائے کی بنیاد پر بغیر محنت کے کمائی کو وہ اچھا نہیں سمجھتا۔ اس کے نزدیک اصل چیز محنت ہے ‘سرمایہ نہیں ۔مثلاً اس کی بد ترین صورت یہ ہے کہ کسی کاروبار میں سرمایہ لگانے والا شخص منافع میں شریک ہو لیکن نقصان میں حصہ دار نہ ہو‘ اور منافع کی بھی متعین شرح لینے پر مصر ہو تو یہ ایک انتہا پسندانہ سطح ہے جس میں وہ محض سرمائے کی حیثیت سے کمائی کا حق دار بنتا ہے۔ اس مثال سے چار امور سامنے آتے ہیں:

(۱) سرمایہ بحیثیت سرمایہ منافع کا مستحق ٹھہرا ۔

(۲) اپنے تحفظ کی ضمانت ۔

(۳) نقصان میں عدم شرکت۔

(۴) نفع کی ایک متعین شرح۔

جہاں یہ چاروں صورتیں جمع ہوں تو یہ ربا ہے اور اسلام نے اپنے نظامِ معیشت میں اس کی جڑ کاٹ دی ہے۔ زنا ‘شراب غرض کسی برائی کے بارے میں قرآن مجید نے وہ سخت لہجہ اختیار نہیں کیا جو ربا کے بارے میں اختیار کیا ہے۔ ربا کے بارے میں اس کی آتش غضب یوں بھڑکتی ہے:

{یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ ذَرُوۡا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲۷۸﴾فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ۚ} (البقرۃ)

’’اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سود میں سے جو باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم واقعی مؤمن ہو۔ پھر اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے میں جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔‘‘

اس قدر سخت وعید کسی اور معاملے میں نہیں آئی‘ اور اس کی بہترین وضاحت اور ہماری ذہنی سطح کے مطابق بات قرآن کے مزاج شناس اور اللہ کے پیارے رسولﷺ نے یوں فرمائی:

((اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ حُوْبًا اَیْسَرُھَا اَنْ یَنْکِحَ الرَّجُلُ اُمَّہٗ)) (رواہ ابن ماجہ والبیہقی)

’’ربا کے ستر جزو ہیں ‘اُن میں سب سے ہلکا یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں سے نکاح کرے۔ ‘‘

یہ انداز ہمیں ناگوار محسوس ہوتا ہے کہ حضور اکرمﷺ نے ایسی تشبیہہ کیوں اختیار کی‘ لیکن غور کریں تو اس کی حکمت روزِ روشن کی طرح ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے ہمیں طبعی طور پر نفرت ہے اور بعض چیزیں اس کے ہم پایہ برائی ہیں لیکن ہم انہیں جبلی یا طبعی طور پر برائی نہیں سمجھتے۔ جب کوئی شخص انہیں پہلی چیزوں کے مقابلے میں لائے گا اوران سے تشبیہہ دے کر بیان کرے گا تو حقیقت واضح ہو گی۔ یہی حکمت حضور ﷺ کے اس فرمان میں پوشیدہ ہے۔ تم شاید اسے جرم نہ سمجھو ‘یہ کہہ کر خود کو مطمئن کر لو کہ سود لے لیا تو کون سی برائی ہو گئی‘ یہ در اصل ماں سے نکاح کرنے کے مترادف ہے۔ گویا ہمارے نظامِ شریعت میں بد ترین برائی ربا قرار پاتی ہے۔ نظامِ سرمایہ داری میں سب سے زیادہ اہمیت ہی سرمائے اور اس کے تحفظ کو ہے اور اسلام نے اسے ربا قرار دے کر اس کی جڑ ہی کاٹ دی ہے۔ اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ جس میں سرمایہ مارکیٹ کو کنٹرول کرتا ہے‘ اس کے اتار چڑھائو کا باعث بنتا ہے۔ ایک شخص دس لاکھ روپے سے اپنی مالی حیثیت کا تعین کراتا ہے۔ اب وہ سٹہ کھیلتا ہے۔ زبانی کلامی ہی خریدا اور بیچ دیا‘ لیا اور دیا ۔صرف اپنی مالی حیثیت کی بنا پر مارکیٹ میں اُتار چڑھاؤ پیدا کرتا ہے ‘ورنہ حقیقت میں نہ کچھ لیتا ہے اور نہ دیتا ہے۔ کبھی یک دم مال خرید کر قیمتیں چڑھا دیتا ہے اور کبھی مال ریلیز کر کے قیمتیں گھٹا دیتا ہے۔ یہ سب سرمائے کا کھیل ہے۔ سرمایہ منڈی سے کھیل رہا ہوتا ہے۔

کراچی سٹاک ایکس چینج میں یہ دلچسپ صورت ِحال دیکھی جا سکتی ہے کہ نظری طور پر سودے ہو رہے ہیں‘ نہ کچھ لینا اور نہ کچھ دینا۔ پاگلوں کی طرح چیخ پکار ہوتی ہے اور سیٹھوں ‘ساہوکاروں کو اطلاع دینے کے لیے دوڑتے ہیں۔ یہ منڈی کا اتار چڑھاؤ ہو رہا

ہوتا ہے اور سرمایہ داروں کا کھیل۔

اسی ضمن میں انشورنس آتی ہے۔ ان سب چیزوں کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ انشورنس میں دو پہلو ہیں جو حرمت لیے ہوئے ہیں ‘ایک تو جوا ہے اور دوسرا سرمائے کے تحفظ کی ضمانت۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھئے۔ایک شخص دس لاکھ روپے سے ماچس بنانے کا کارخانہ قائم کرتا ہے اور دس لاکھ روپے کی انشورنس کراتا ہے۔ اس کا سرمایہ آفاتِ سماویہ کی زد میں ہے۔ کوئی اتفاقی حادثہ‘ آگ یا سیلاب اس کار خانے کو تباہ کر سکتا ہے۔ لیکن وہ اپنے سرمائے کا تحفظ یوں کرتا ہے کہ اس کی انشورنس کرواتا ہے اور دُوسرا ظلم یہ کرتا ہے کہ یہ تحفظ اپنی جیب پر بوجھ ڈال کر حاصل نہیں کرتا بلکہ اس کا سالانہ پریمیم بھی جو وہ ادا کرتا ہے لاگت میں شمار کرتا ہے۔ ماچس کی ایک ڈبیہ پر وہ پریمیم کی لاگت ڈالتا ہے اور صارف سے اس کی قیمت وصول کرتا ہے‘ صرف اس لیے کہ کسی حادثے کی صورت میں اس کا سرمایہ محفوظ ہو جائے ۔ جہاں تک اجتماعی مفاد کا تعلق ہے ہمارا ایک ملک ایک قوم ہے ‘جس کے مادی مفادات مشترک ہیں۔ تباہی تو آ گئی اور دس لاکھ روپے کا سرمایہ ملکی سطح پر ضائع ہو گیا‘ لیکن سرمایہ دار اس نقصان میں سے ایک پائی بھی برداشت کرنے کے لیے آمادہ نہیں اور خریدار کا خون چوس کر اپنے سرمائے کا تحفظ کرتا ہے۔ یہ سرمایہ داروں کی امداد باہمی کا نظام ہے جو اپنے سرمائے کا تحفظ کر رہے ہیں۔ اس کی حرمت کے لیے اسلام نے قطعی فیصلہ کر دیا ہے: {کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ ؕ }۔

ایک دائرہ اور بھی ہے جس میں بعض چیزیں حلال اور بعض حرام ہیں اور بعض وہ ہیں جن کی حلت و حرمت میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان چیزوں کو ہم ایک ہی گروپ میں لاتے ہیں۔ ایک شخص محنت کر سکتا ہے‘ صحت مند اور محنتی ہے ‘لیکن اس کے پاس سرمایہ موجود نہیں۔ اس کے برعکس ایک دوسرا شخص ہے جس کے پاس سرمایہ موجود ہے۔ یہ دونوں مل کر کاروبار کرتے ہیں۔ ایک شخص سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسرا اس میں اپنی محنت شامل کرتا ہے۔ اس محنت اور سرمائے کے امتزاج کو مضاربت کہتے ہیں۔ یہ اسلام میں جائز ہے لیکن پسندیدہ نہیں۔ جس طرح طلاق جائز ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ نا پسندیدہ چیز۔ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ جس کے پاس صرف اس قدر سرمایہ ہے کہ وہ اپنی ضرورت ہی پوری کر سکتا ہے تو وہ

خود کاروبار کرے اور اپنی ضروریات پوری کرے ‘لیکن اگر اس کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی موجود ہے‘ مثلاً وہ ملازمت کرتا ہے تو اس کے پاس جو ضرورت سے زائد سرمایہ ہے وہ اپنے مجبور بھائی کو دے دے اور اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس کی محنت میں سے حصہ نہ بٹائے۔

مضاربت میں بھی شرط رکھی گئی ہے کہ نقصان کا پورا بوجھ سرمائے پر پڑے گا اور محنت کش ایک پائی کے نقصان میں بھی شریک نہیں ہو گا۔ اسلام نے محنت کے تحفظ کو منافع کا جائز ذریعہ قرار دیا ہے ۔اس صورت میں وہی مضاربت جائز ہو گی جس میں نقصان کی پوری ذمہ داری سرمایہ فراہم کرنے والا شخص برداشت کرے اور منافع میں وہ محنت کش کا ساجھی ہو۔ لیکن یہ وضاحت دوبارہ کر لی جائے کہ اسلام کے نزدیک یہ عمل بھی پسندیدہ نہیں۔ اس کا پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ اصل زائد سرمایہ رکھنے والا شخص یہ سرمایہ کسی دوسرے ضرورت مند مسلمان بھائی کو بطور قرض حسنہ دے تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوسکے اور اس کی خوشحالی قومی خوشحالی میں حصہ دار بنے۔ اس سے اجتماعی زندگی میں حسن پیدا ہو گا۔ اگر آپس کے معاملات مجبوری میں طے پائیں تو یہ حسن کہاں پیدا ہو گا! قرآن مجید بیع کو بھی باہمی رضا مندی سے مشروط کرتا ہے: {عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡکُمۡ ۟} (النسائ:۲۹) یعنی تمہاری رضا مندی سے۔

مثال کے طور پر آپ کو ایک جوتا خریدنا ہے۔ آپ مارکیٹ میں گھومیں پھریں۔ آپ کو اندازہ ہے کہ اس وقت ایک معیاری جوتے کی قیمت سو سوا سو روپے ہے۔ آپ خریدتے ہیں تو اس میں کسی مجبوری کا دخل نہیں ہوتا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ اس وقت لاگت اس قدر ہے۔ اس پر منافع کی شرح اندازاًیہ ہو گی۔ یہ باہمی رضا مندی کا سودا ہے۔ لیکن کوئی ایسا معاملہ جس میں کوئی شخص کسی مجبوری کے تحت ایسا کر رہا ہو ناپسندیدہ ہے۔ اگرچہ سرمایہ رکھنے والا شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ صاحب وہ میرے پاس اپنی خوشی سے آیا ہے اور سرمایہ لے کر کاروبار کرنے کی صورت میں اس کے منافع میں مجھے شریک کرنے کی پیشکش کی ہے ‘ اس میں کسی مجبوری کو کوئی دخل نہیں ---لیکن حقیقتاً اس کی مجبوری کواس میں دخل ہے۔ اگر اس کے پاس سرمایہ موجود ہو تو وہ کسی کو اپنے خون پسینے کی کمائی میں کیوں شریک کرے گا؟ یہ مضاربت کی وہ شکل

ہے جو قانونی طور پر حلال ہے لیکن اسلام اسے پسند نہیں کرتا۔

مزارعت

اسی قبیل کی ایک چیز مزارعت بھی ہے۔ ایک شخص کی زمین ہے‘ دوسرا اس پر محنت کرتا ہے اور اس کی پیداوار میں زمیندار کو شریک کرتا ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد مشین اور دوسری چیزیں یا معدنیات بھی ذرائع پیداوار میں شامل ہو گئیں۔ لیکن قدیم ترین ذریعہ پیداوار زمین ہی ہے اور زمین کے بارے میں بقول علامہ اقبال اسلام کا نقطئہ نظریہ ہے: ؎

**رزقِ خود را از زمیں بردن رواست**

**ایں متاعِ بندہ و ملک خداست!**

مزارعت کے بارے میں ہمارے ہاں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ اسے حرامِ مطلق کہتے ہیں ‘وہ کسی نوع کی مزارعت اور غیر حاضر زمینداری کو جائز نہیں سمجھتے۔ دوسرے فقہاء نے احادیث پر ذرا غور کر کے کچھ ایسے پہلو نکالے ہیں جس سے کچھ گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اُس دور کے خاص حالات تھے۔ مصالح مرسلہ یا استحسان کے اصول کے تحت ایسی گنجائش نکالی گئی‘ ورنہ حضور اکرم ﷺ نے تو مزارعت پر لفظ ربا استعمال کیا ہے۔

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضورﷺ کو معلوم تھا کہ ان کے پاس کوئی زمین نہیں ہے۔ آپ ﷺ مدینہ منورہ سے کہیں باہر جا رہے تھے‘ دیکھا کہ رافع ایک کھیت کو پانی لگا رہے ہیں۔ آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا کہ کھیتی کس کی ہے اور زمین کس کی ہے؟ انہوں نے عرض کیا :کھیتی میری ہے‘ بیج میں نے ڈالا ہے اور محنت بھی میں نے کی ہے‘ جبکہ زمین بنی فلاں کی ہے۔ پیداوار ہمارے درمیان نصف نصف تقسیم ہوگی۔اس پر حضورﷺ نے فرمایا: ((اَرْبَیْتُمَا)) (تم دونوں نے ربا کا معاملہ کیا ہے) ’’یہ زمین اس کے مالک کو لوٹا دو اور جو کچھ اس پر تمہارا خرچ ہوا ہے وہ تم اس سے لے لو‘‘ ۔ اس لیے کہ اس زمین میں اُس کی کون سی محنت شامل ہے جس کا وہ معاوضہ لے رہا ہے؟ صرف اس وجہ سے کہ زمین کا مالک ہے وہ اپنے بھائی کی گاڑھے پسینے کی کمائی سے حصہ وصول کررہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مزارعت کے بارے میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ کا فتویٰ آنکھیں کھول دینے والا ہے اور ہمیں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے ۔ویسے تو یہاں ملک کی نوے فی صد آبادی حنفیوں پر مشتمل ہے ‘لیکن ایسے اہم معاملات میں امام ابو حنیفہ کا فتویٰ کوئی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ ویسے تو انہیں امام اعظم کہا اور مانا جاتا

ہے اور سید الفقہاء بھی‘ لیکن جہاں ان کا فتویٰ اچھا نہیں لگتا اسے اٹھا پھینکنے اور دیوار پر دے مارنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ یہ ہماری دو عملی ہے جس پر ہمیں غور کرنا چاہیے۔ مزارعت اور مضاربت کو ہم نے تیسرے درجے میں رکھا ہے۔

اب آئیے چوتھی صورت کی طرف ‘کہ جو مال موجود نہ ہو اس کے بیع کی جو شکل بھی ہو گی اسلام میں حرام ہو گی۔ یہ جتنے ایڈوانس سودے ہو رہے ہیں‘ یہ تمام معاملات جن میں سرمایہ کھیلتا ہے ان سب کے دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔ بیع وہ ہے کہ مال موجود ہے اور قیمت ادا کر دی گئی یا دو چیزیں ہیں جن کا تبادلہ ہو گیا۔ ایک ہاتھ سے دیا دوسرے ہاتھ سے لیا‘ یہ بیع ہے اور اس میں بھی باہمی رضامندی (عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ) ضروری ہے۔ اگر مجبوری سے فائدہ اٹھایا گیا ہے‘ اگر کہیں مصنوعی قلت کے ذریعے سے ریٹ بڑھا دیے گئے ہیں‘ اگر کہیں کوئی اور کھیل کھیلا گیا ہے تو اس میں حرمت کا پہلو شامل ہوجائے گا۔ ہمارے ہاں جو سودے بازی ہوتی ہے کہ زمین آپ نے ٹھیکے پر دی ہے‘ اب چاہے کسان کو کچھ بچے نہ بچے آپ کا ٹھیکہ محفوظ ہے‘ باغ میں ابھی پھل نہیں آیا اس کا سودا ہو گیا ہے‘ یہ سب حرام مطلق ہے۔ ہمارے دین میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ اُدھار کی شکل میں صرف ایک سودا جائز ہے جسے بیع سلم کہتے ہیں۔ دو چیزوں کا بالکل تعین ہوجائے اور ان میں سے ایک چیز کاملاً دے دی جائے یہ بیع سلم ہے۔ ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ فلاں چیز فلاں وقت لے لوں گا اور یہ بیعانہ لے لیجیے۔ اگر وقت پر وہ چیز نہ دے سکا تو بیعانہ ہضم۔ اب یہ بیعانہ کس کھاتے میں ہضم ہو رہا ہے؟ وہ سودا تو پورا ہو نہیں پایا۔ یہ ساری چیزیں در حقیقت اس وجہ سے ہمارے ہاں رواج پا گئی ہیں کہ ہمارے یہاںشریعت کوئی ہیئت حاکمہ کی حیثیت سے ہے ہی نہیں‘ مارکیٹ میں جو رواج چلا وہ ہم نے اختیار کر لیا۔

اوو رٹریڈنگ

ایک شخص کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں اور وہ اوو رٹریڈنگ میں پچاس لاکھ روپے کا مال لے لیتا ہے تو اسلام میں اسے نا جائز قرار دیا گیا ہے۔ اگر آپ کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں تو پانچ لاکھ کا سودا کر لیجیے ‘پانچ لاکھ اسی وقت آپ کو دے دیناہوں گے۔ اس ادائیگی کو بیع سلم کہتے ہیں۔ بیع کے ضمن میں بھی حدود قائم کر دی گئی ہیں اور ان سب کا مقصد یہی ہے کہ سرمائے کو زیادہ کھل کھیلنے

کا موقع نہ ملے۔ اسی سلسلے میں میری زندگی کا ایک یاد گار واقعہ ہے کہ میں اسی شہر لاہور کے ایک بڑے دار العلوم میں ایک عالم دین سے ملنے گیا۔ شیخ الحدیث ہیں‘ حدیث کا درس دے رہے تھے‘ میں بھی بیٹھ گیا۔ مشکوٰۃ شریف کی ایک حدیث زیر درس تھی جو کئی طرق سے آئی متن وہی ہے طُرق مختلف ہیں :

((لَا یَبِعْ حَاضِرٌ لِبَادٍ)) یعنی کوئی کسی جگہ کا رہنے والا شخص باہر سے آنے والے کے مال کو فروخت نہ کرے۔ درس مکمل ہو گیا‘ موجودہ کاروبار کے بارے میں کوئی ریفرنس نہ آیا۔ ہمارے معاشرے میں بیع و شراء کے جو طریقے ہیں اس پر کوئی بحث نہ ہوئی۔ میں نے سوال کیا: ’’حضرت! ہمارے ہاں جو آڑھت کا کاروبار ہوتا ہے اس حدیث کی روشنی میں اس کا کیا حکم ہے؟‘‘

شیخ الحدیث نے جو جواب دیا وہ آپ بھی سنیےاور تعجب کیجیے۔ انہوں نے مجھ سے سوال کیا: ’’یہ آڑھت کیا ہوتی ہے؟‘‘ اب یہ تجاہل عارفانہ تھا یا فی الواقع انہیں معلوم نہیں تھا‘واللہ اعلم!میں نے جب تشریح کی کہ یہاں کچھ لوگ منڈیوں میں دکانیں اور اڈے بنا کر بیٹھتے ہیں‘ باہر سے کاشت کار اناج اور سبزیاں لے کر مختلف منڈیوں میں آتے ہیں اور یہ آڑھتی ان کا مال فروخت کرتے ہیں اور اپنا کمیشن لیتے ہیں۔ ان کا جواب تھا کہ ’’یہ تو مطلقاً حرام ہے۔‘‘

اب اندازہ کیجیے کہ یہ فیصلہ کتنا قطعی ہے۔ اس میں بھی لوگوں نے حلال کے بہت سے پہلو نکال لیے ہیں کہ دو طرفہ آڑھت کا حکم تو یہی ہے ‘لیکن اگر ایک طرف کمیشن لیا جائے تو وہ حرام نہیں ہو گا‘ اس لیے کہ یہ دوسری شکل ہو جاتی ہے‘ گویا وہ خریدار کی طرف سے وکیل بن گیا‘ جو وکالت کر کے اس کی طرف سے مال کا خریدار ہے‘ اس طرح وہ اپنی وکالت کی اُجرت لے رہا ہے جس میں اس کے لیے حلت کا پہلو پیدا ہو گیا ہے۔ اس تاویل میں بھی کسی بد نیتی کو دخل نہیں ‘لیکن میں عرض کروں گا کہ ہمارے ہاں فقہاء نے اصول ایسے بنائے ہیں کہ جو عموم بلویٰ ہو یعنی کوئی چیز عام ہو گئی ہو یا زمانے کا ایک خاص چلن بن جائے

اور اب اس کو بالکل ختم کرنا ممکن نہ ہو تو اسے مصالح مرسلہ کہہ لیں یا استحسان ‘بہر کیف ایسی چیزوں کے بارے میں فقہاء نے لوگوں کے لیے آسانی کی گنجائش پیدا کی ہے ۔مختصراً یہ کہ اس کے اندر جو حلت کا پہلو نکالا گیا ہے وہ یہ ہے کہ دو طرفہ آڑھت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ حرامِ مطلق ہے اور ہمارے ہاں اجناس‘ سبزیوں اور گوشت کا جو کاروبار ہوتا ہے وہ اس دو طرفہ آڑھت ہی کی بنیاد پر ہوتا ہے‘ مثلاً گوشت کی قیمتوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش ہوتی ہے تو قصائی شور مچاتے ہیں کہ ساری مصیبت ان آڑھتیوں کی ڈالی ہوئی ہے جو اصل مہنگائی کا باعث ہیں۔ اس میں خرابی در خرابی یہ ہے کہ آڑھتی اپنا سرمایہ ایڈوانس کرتا ہے اور اس طرح پابندی لگاتا ہے کہ اپنا مال میرے ذریعے فروخت کرو گے۔ یہ خالص ربا ہے کہ کسی نے کوئی رقم کسی کو دی اور اس رقم سے چاہے کوئی گن کر نقد معاوضہ نہیں لیا لیکن دوسرے کو اس کا پابند کیا کہ وہ اپنا مال اس کے ذریعے فروخت کرے گا ۔ یہ درحقیقت ربا ہے‘ یہ گندگی ہے اور ’’ظُلُمَاتٌ بَعْضُھَا فَوْقَ بَعْضٍ‘‘ کا مصداق ہے۔ بیع کے بارے میں ان حدود و قیود کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ اسلام نے اپنے فقہی و قانونی نظام میں بھی ایسے اقدامات کیے ہیں کہ سرمائے کو زیادہ کھل کھیلنے کا موقع نہ ملے۔

رومن امپائر کے عہد میں کرنسی ایجاد ہوئی تھی۔ انسان کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنی بڑی مصیبت اپنے سر پر مسلط کر رہا ہے۔ جب تک یہ کرنسی کا تصور نہیں تھا دنیا میں لین دین ہو رہے تھے‘ لیکن تبادلے کی بنیاد پر تھے۔ اجناس کا تبادلہ تھا۔ ایک شخص نے کھیت میں کام کیا اور فصل پیدا کی ۔ دوسرا شخص کرگھے پر بیٹھا ہوا کھدر بنا رہا ہے‘ دونوں اپنی ضرورت کے مطابق تبادلہ کر لیتے۔ اس میں ذخیرہ اندوزی نہیں ہوتی تھی۔ وہ کتنی گندم اکھٹی کر لے گا؟ لیکن جب سونے کو معین کر دیا گیا کہ ایک تولہ سونا مساوی ہے اتنے گز کپڑے کے یا اتنے من گندم کے تو کرنسی کی لعنت درمیان میں آگئی۔ اب سرمایہ داری کا آغاز ہوا۔ آپ نے اپنی تجوری میں فرض کیجیے دس سیر سونا رکھا ہوا ہے‘ اب آپ کو موقع مل گیا‘ آپ جس طرح چاہیں مارکیٹ سے کھیلیں ‘جس طرح چاہیں اونچا نیچا کر لیں‘ جس طرح چاہیں کنٹرول کریں۔ یہ اس سرمایہ کی لعنت ہے جس میں اصل چیز کرنسی ہے۔ اس کرنسی نے یہ

سارے امکانات پیدا کیے۔ سرمائے کی اپنی ایک فارم ہے ‘جبکہ آج کل کی اصطلاح میں مکان اور انسانی محنت بھی سرمایہ ہے ‘لیکن انسان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے والی فارم کرنسی نے یہ ساری مصیبتیں انسان پر لادی ہیں‘ ورنہ انسانی ضرورت آپس کے تبادلہ سے پوری ہو سکتی ہے۔ اس میں خواہ مخواہ تعریف کا پہلو تلاش نہ کیا جائے تو یہ ایک حقیقت ہے کہ اشتراکی ممالک میں اس وقت جو معاشی ضروریات آپس کے تبادلہ سے پوری کی جاتی ہے اور کرنسی کا عمل دخل کم سے کم ہے‘ انسان ٹھوکریں کھا کر وہاں پہنچ رہا ہے جہاں نبی اکرم ﷺ نے اور اللہ تعالیٰ کی کتاب نے چودہ سو سال پہلے پہنچا دیا تھا: ((لَا یَبِعْ حَاضِرٌ لِبَادٍ)) ۔ایک شخص نے گندم پیدا کی ہے وہ آ کر خود بیچے اور اگر کسی کے پاس دس ہزار روپیہ ہے وہ اس دس ہزار کی گندم خرید کر بیچے۔ لیکن اگر ایک شخص اڈہ بنا کر بیٹھ جائے اور اس اڈہ کی بنا پر کماتا ہے تو یہ حرام ہے۔ یہ حدود وہ ہیں جن سے سرمایہ کاری سرمایہ داری نہیں بنتی‘ سرمایہ کینسر بن کر مسلط نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ کچھ اضافی اقدامات ہیں۔ جو دولت بھی مرتکز ہو گئی ہے اسے تقسیم کرنے کے لیے‘ گردش میں لانے کے لیے وراثت کے احکام ہیں۔ اسلام کا رجحان ارتکازِ دولت کی طرف نہیں بلکہ تقسیم دولت کی طرف ہے اور وراثت اس میں ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔

اس طرح سے اس میں دو چیزیں مزید شامل کر لیجئے۔ انسانی کمزوریوں کو exploit کر کے کمانا۔ جنس انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ اس کے اس جنسی جذبے کو مشتعل کر کے کمانا حرامِ مطلق قرار دیا گیا اور ہمارے ہاں فلم انڈسٹری کا کاروبار اسی بنیاد پر ہے۔ اس لیے میں نے اس کو کمزوری کہا ہے۔ قرآن مجید نے بھی شرم گاہ کے لیے لفظ فرج استعمال کیا ہے ‘ یعنی ’’اندیشے کی جگہ‘‘ ۔فصیل میں جہاں دراڑیں پڑ جائیں ‘ جہاں سے ایک غنیم کو اندر آنے کا موقع مل سکتا ہے وہ ’’فرج‘‘ ہے ۔چنانچہ اعضائے جنسی کو بھی قرآن حکیم فرج سے تعبیر کرتا ہے کہ انسانی شخصیت کی فصیل میں یہ سب سے بڑی اندیشے کی جگہ ہے‘ اس کا کمزور پہلو ہے ‘یہاں سے اس پر بڑی جلدی سے حملہ کیا جا سکتا ہے ۔شراب کی حرمت اور فحاشی کے کاروبار پر قدغن کی یہی حکمت ہے۔ انسان اگر دولت‘ دولت کے لیے کماتا ہے تو اس میں ایک بہت بڑا عنصر اس کی عیاشی کرنے کی خواہش ہوتا ہے ‘لیکن اسلام نے عیاشی کے دروازے ہی بند کر دیے ہیں۔ اب ایک انسان سرمائے کو لے کر کیا کرے گا؟ آخر وہ سرمایہ کاہے کے لیے ہے؟ اس طریقے سے سرمائے کے ساتھ attachment کم

کر دی گئی ہے۔

اسلام نے سرمایہ داری پر مختلف پہلوؤں اور مختلف اطراف سے حملے کیے ہیں اور ان سب کا حاصل یہ ہے کہ اس نے اپنے قانونی نظام میں نجی ملکیت (private ownership) کی صورت بھی بر قرار رکھی ہے۔ ذاتی دلچسپی کو بروئے کار لانے کا موقع دیا ہے ۔گویا کھلا بھی چھوڑ دیا ہے‘ محنت بھی کرو‘ کوشش بھی کرو‘ بھاگ دوڑ کرو‘ کھیت میں خوب محنت سے ہل چلاؤ‘ پسینہ بہاؤ۔ جو کچھ نکلے گاتمہارا ہے‘ اس پر کوئی ظلم اور جبر کے ساتھ قبضہ نہیں کر سکے گا۔ اس میں سے جو حق معین ہے وہ دے دو۔ اس حق معین کے ذریعے تو کفالت ِ عامہ کا بندوبست ہو گیا کہ have not اور have کی تقسیم زیادہ نہ بڑھنے پائے اور کوئی بھی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہ جائے۔ یہ وہ نقطہ عدل ہے کہ آزادی بھی بر قرار رہے اور مساوات بھی۔ اس کے علاوہ اسلام کے نظام میں یہ گنجائش بھی ہے کہ اگر کسی موقع پر زکوٰۃ اور عشر کے ذریعے سے حاصل شدہ رقوم سے کفالت ِ عامہ کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں تو جبری ٹیکس وصول کرنے کا اختیار ہے۔ یعنی حق ملکیت کو بھی کسی طرح کا تقدس عطا نہیں کیا گیا جو کسی سرمایہ دار نظام میں ہوتا ہے‘ بلکہ وہاں اس ریاست کو جو غرباء و مساکین کی کفیل ہے یہ حق حاصل ہے کہ اگر اس کی ضروریات کسی وقت اتنی بڑھ جائیں یا کوئی ایمرجنسی کی صورت ہو‘ مثلاً جنگ شروع ہو گئی‘ قحط نے آ لیا اور صرف زکوٰۃ و عشر سے کفالت کے تقاضے پورے نہیں ہوتے تو حکومت مزید بھی لے سکتی ہے۔ دوسری طرف اگر کسی کاروبار کو پبلک سیکٹر میں دینے سے عدل کے تقاضے پورے نہیں ہوتے تو ریاست کو نیشنلائزیشن کی بھی اجازت ہے‘ کیونکہ اصل قدر عدل ہے۔ مثلاً اجارہ داری ہے‘ کسی چیز کا صرف ایک ہی کارخانہ ہے ۔اب مالک کے لیے یہ موقع ہے کہ جو وہ قیمت چاہے وصول کرے اور لوگ دینے پر مجبور ہیں۔ اس صورت میں چونکہ تقاضائے عدل پورا نہیں ہوتا‘ اس صنعت کو قومی ملکیت میں لینے کی پوری آزادی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں عراق کی زمینیں فتح ہوئیں۔ (یہ بات آپ کے ذہن میں رہنی چاہیے کہ عراق اور شام کا علاقہ انتہائی زرخیز ہے۔) فتوحات کے بعد مطالبہ کیا گیا کہ یہ زمینیں فوج میں تقسیم کر دی جائیں ‘اس لیے کہ یہ مالِ غنیمت ہے۔ اس پر تنازعے کی صورت پیدا ہوئی۔ دونوں طرف سے دلائل دیے گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اجتہادی بصیرت

نے فیصلہ دیا کہ اس طرح عدل کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے۔ بلکہ یہ سب ریاست کی ملکیت ہوں گی اور اس پر کام کرنے والے موروثی مزارع کی حیثیت سے کام کرتے رہیں گے‘ البتہ اسلامی ریاست لگان وصول کرے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اگر یہ فیصلہ نہ فرماتے تو اسلام کے ذریعے دنیا میں بد ترین جاگیرداری نظام رائج ہو جاتا ‘کیونکہ ان فوجیوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ قانون کے ڈھانچے میں بھی غرباء کی مصلحت کو پیش نظر رکھا گیا۔ بجائے سرمایہ کے محنت کو اتنا تحفظ دیا گیا کہ اگر کہیں نقطہ عدل بحال نہ رہے تو اسے نجی ملکیت سے نکال کر قومی تحویل میں لے لیا جائے۔ اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہاد چمکتا ہوا سورج ہے۔

اسلامی ریاست میں دونوں نظام علیحدہ علیحدہ نہیں ہوتے‘ یہ بیک وقت ہوتے ہیں اور اسلام کی برکات کا ظہور صرف قانونی نظام سے نہیں ہو پائے گا جب تک کہ معاشرے میں کچھ ایسے لوگ موجود نہ ہوں جو ایمانی اور رُوحانی سطح پر زندگی بسر کریں‘ کیونکہ معاشرے کی اقدار کو کنٹرول یہی لوگ کرتے ہیں۔ ہمارے موجودہ معاشرے میں اصل قدر دولت اور سرمایہ ہے۔ جس کے پاس دولت اور سرمایہ ہے اسے بڑے سے بڑا شخص جھک کر ملے گا۔لیکن روحانیت کے علم برداروں کے ہاں یہ بات نہیں۔ وہ جو سلطان الہند نظام الدین اولیاء رحمہ اللہ علیہ جیسے گدڑی پوش درویش ہیں اور گویا اسلام کی ایمانی و روحانی تعلیمات کا مظہراتم ہیں‘ انہیں دنیا کی کسی شے سے رغبت نہیں۔ وہ دنیا کی کسی چیز کی ملکیت اختیار کر کے فخر کرنے والے نہیں۔ دن بھر کی ضرورت کے لیے دال روٹی اور سر چھپانے کے لیے ایک چھت میسر ہے تو بس اس سے زیادہ کسی مزید چیز کے حصول کی خواہش نہیں۔ مال وزر کے انبار انہیں قطعاً متاثر نہیں کرتے۔ جب تک کہ معاشرے میں ایسے لوگ موجود نہ ہوں جو اس اعلیٰ سطح پر زندگی بسر کرتے ہوں اور وہ آیت {وَ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَا ذَا یُنۡفِقُوۡنَ ۬ؕ قُلِ الۡعَفۡوَؕ} کا نمونہ بن جائیں‘محض قانونی اقدامات سے معاشرے کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اس لیے معاشرہ میں ایک ایسا طبقہ موجود رہنا چاہیے جس سے معاشرتی اقدار کا تعین ہوتا ہے‘ جس سے وہ ایمانی حقیقت سامنے آتی رہتی ہے کہ اصل مسئلہ معاش کا نہیں معاد کا ہے‘ اصل چیز دولت نہیں نیکی ہے‘ عمل صالح ہے‘ اللہ کا نام ہے اور اُس کے رسول کا اتباع اور ان کی محبت ہے۔ یہ اقدار اگر معاشرے میں روشنی کے مینار کی طرح بالفعل موجود نہ ہوں تو اسلام کی برکات کا کامل ظہور

کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس بات کو ایک نا گزیر ضرورت کی حیثیت سے سامنے رکھیے کہ یہ نقشہ بھی معاشرے میں موجود رہنا چاہیے‘ ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ موجود رہنے چاہئیں ----اور ابو ذرؓ تو ایک انتہا کو پہنچ گئے تھے‘وہ فقراءِ صحابہ اور اصحاب ِصفہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی تو معاشرے کے اندر موجود تھے‘ انتہائی مسکین روکھی سوکھی کھانے والے ‘جنہوں نے سب کچھ اللہ اور اس کے رسول کی راہ میں دے دیا تھا ‘جیسے حضرت ابو الدرداء‘ حضرت مقداد اور حضرت انس بن مالک رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ۔ ایسے لوگوں کے متعلق جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کے چہرے غبار آلود ہوتے ہیں‘ لیکن اللہ کے ہاں ان کا مقام یہ ہے کہ اگر کسی بات پر اللہ کی قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسموں کی لاج رکھے گا۔ یہ ہے ہمارے روحانی نظام کا ایک نقشہ۔ اگر یہ موجود نہ ہو تو محض قانونی نظام ہمارے مسائل کا حل نہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس نے مکہ کی زمین کا کرایہ لیا اس نے سود کھایا ‘ کیونکہ لوگ حج کی ادائیگی کے لیے مکہ آنے پر مجبور ہیں۔ اب یہاں کے پروہت اور پنڈت کئی ہزار روپے ایک چھوٹے سے کمرے کے چند دنوں کے لیے وصول کرتے ہیں اور یہ سب ان کے نزدیک حلال ہے اور اس پر عیش کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ان کی ساری دولت پہلے بیروت میں عیاشیوں اور فحاشیوں پر خرچ ہوتی تھی‘ اب لندن‘ پیرس اور امریکہ میں خرچ ہوتی ہے۔ اگر صرف قانونی حیلہ بازیوں پر اکتفا کیا جائے تو یہی نتیجہ بر آمد ہوتا ہے۔ اس لیے قانونی اور روحانی نظام کے حسین امتزاج سے ہی اسلام کا معاشی نظام ترتیب پاتا ہے ‘اور جہاں ان دو کی یکجائی ہو تب کسی نظام کو اسلام کا معاشی نظام کہا جا سکتا ہے۔ یہ ہیں چند نکات جن کی روشنی میں ایک اسلامی فلاحی معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

؏ گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں!

**خاکسار اسرار احمد عفی عنہ**

**۲۴/اگست۱۹۸۲ء**

کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس بات کو ایک نا گزیر ضرورت کی حیثیت سے سامنے رکھیے کہ یہ نقشہ بھی معاشرے میں موجود رہنا چاہیے‘ ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ موجود رہنے چاہئیں ----اور ابو ذرؓ تو ایک انتہا کو پہنچ گئے تھے‘وہ فقراءِ صحابہ اور اصحاب ِصفہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی تو معاشرے کے اندر موجود تھے‘ انتہائی مسکین روکھی سوکھی کھانے والے ‘جنہوں نے سب کچھ اللہ اور اس کے رسول کی راہ میں دے دیا تھا ‘جیسے حضرت ابو الدرداء‘ حضرت مقداد اور حضرت انس بن مالک رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ۔ ایسے لوگوں کے متعلق جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کے چہرے غبار آلود ہوتے ہیں‘ لیکن اللہ کے ہاں ان کا مقام یہ ہے کہ اگر کسی بات پر اللہ کی قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسموں کی لاج رکھے گا۔ یہ ہے ہمارے روحانی نظام کا ایک نقشہ۔ اگر یہ موجود نہ ہو تو محض قانونی نظام ہمارے مسائل کا حل نہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس نے مکہ کی زمین کا کرایہ لیا اس نے سود کھایا ‘ کیونکہ لوگ حج کی ادائیگی کے لیے مکہ آنے پر مجبور ہیں۔ اب یہاں کے پروہت اور پنڈت کئی ہزار روپے ایک چھوٹے سے کمرے کے چند دنوں کے لیے وصول کرتے ہیں اور یہ سب ان کے نزدیک حلال ہے اور اس پر عیش کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ان کی ساری دولت پہلے بیروت میں عیاشیوں اور فحاشیوں پر خرچ ہوتی تھی‘ اب لندن‘ پیرس اور امریکہ میں خرچ ہوتی ہے۔ اگر صرف قانونی حیلہ بازیوں پر اکتفا کیا جائے تو یہی نتیجہ بر آمد ہوتا ہے۔ اس لیے قانونی اور روحانی نظام کے حسین امتزاج سے ہی اسلام کا معاشی نظام ترتیب پاتا ہے ‘اور جہاں ان دو کی یکجائی ہو تب کسی نظام کو اسلام کا معاشی نظام کہا جا سکتا ہے۔ یہ ہیں چند نکات جن کی روشنی میں ایک اسلامی فلاحی معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

؏ گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں!

**خاکسار اسرار احمد عفی عنہ**

**۲۴/اگست۱۹۸۲ء**

سامعین غلط تھے۔ یہاں مقرر تو یقینا بالکل غلط ہے‘ البتہ سامعین کے بارے میں میں کچھ کہہ نہیں سکتا! بہرحال میں نے یہ گمان کیا کہ میرا انتخاب موضوع کے جزوِ ثانی کے اعتبار سے ہوا ہے ‘یعنی : ’’System of Taxation in Islam‘‘

میں سے مجھ پر نگہ انتخاب اسلام کے ایک ادنیٰ خادم اور قرآن حکیم کے حقیر طالب علم ہونے کی بنا پر پڑی ہے اور میرے لیے یہ بھی یقینا ایک بڑا اعزاز ہے۔ بہرحال میں کوشش کروں گا کہ اصل روحِ دین اور نظامِ اسلام دونوں کے اعتبار سے اسلام میں نظامِ محاصل کے بارے میں جو کچھ میں سمجھ پایا ہوں‘ آپ کے سامنے رکھ دوں!

’’Taxation in Islam‘‘ کے الفاظ سے آپ سے آپ جو حقیقت ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس اصطلاح کے وضع کرنے والوں کے نزدیک اسلام ایک ایسے نظامِ معیشت کا علمبردار ہے جس میں ذاتی ملکیت (private ownership) اور آزاد معیشت (free-enterprise) کو اصولِ موضوعہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ اجتماعی یا قومی ملکیت کے اصول پر مبنی نظام معیشت میں تو سب کچھ حکومت ہی کی ملکیت پر ہوتا ہے‘ لہٰذا محاصل کا مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا!

میں آغازِ گفتگو ہی میںعرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک یہ مفروضہ جزء اً تو درست ہے کلیۃً صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے اور اس سے پوری حقیقت سامنے نہیں آتی!

میرے نزدیک نظامِ معاشی کے اعتبار سے اسلام کے دو رخ یا دو پہلو ہیں‘ اور یہ دونوں ایک دوسرے پر بہت حد تک interdependent ہیں اور اسلام کی برکات و دونوں ایک دوسرے پر بہت حد تک interdependent ہیں اور اسلام کی برکات و ثمرات کا کامل ظہور ان دونوں کے اتصال و اجتماع ہی سے ہو سکتا ہے۔ اور یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہو گا کہ اگر ان میں سے ایک پہلو نگاہوں سے اوجھل رہ جائے اور توجہ صرف ایک ہی پر مرتکز ہو جائے تو اس سے جو تصویر سامنے آئے گی وہ بہت بعید از حقیقت ہو گی۔ ان دو پہلوؤں سے میری مراد یہ ہے کہ اسلام کا ایک اخلاقی و روحانی نظام ہے اور دوسرا قانونی و فقہی نظام۔ ان دونوں کے تقاضے بسا اوقات مختلف ہی نہیں متضاد ہوتے ہیں‘ تاہم ان دونوں کے امتزاج ہی سے اسلام کا کامل نظام وجود میں آتا ہے۔ آپ چاہیں تو ان دونوں پہلوؤں کو ’’دعویٰ‘‘ (thesis) اور ’’جوابِ دعویٰ‘‘

(anti-thesis) سے تعبیر فرما لیں اور ان دونوں کے امتزاج کو synthesis قرار دے لیں‘ بہرحال ان کے وجود سے انکار ممکن نہیں ہے! ایک چھوٹی اور سادہ سی مثال سے بات واضح ہو جائے گی ۔ کوئی شخص آپ کے ایک تھپڑ مار دے تو اگر آپ بالکل عاجز و کمزور نہیں ہیں‘ اس لیے کہ اس صورت میں تو ’’قہر درویش بر جانِ درویش‘‘ کے سوا اور کوئی صورت قابل عمل ہی نہیں ہوتی‘ اس کے برعکس اگر آپ بدلہ لینے پر قادر ہیں تو آپ کے سامنے دو راستے کھلے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ بدلہ لیں اور دوسرے یہ کہ آپ معاف کر دیں۔ اسلام کا قانونی و فقہی نظام بدلے اور قصاص کی حوصلہ افزائی کرتا ہے‘ چنانچہ قرآن حکیم فرماتا ہے: {وَ لَکُمۡ فِی الۡقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰۤاُولِی الۡاَلۡبَابِ} (البقرۃ:۱۷۹) یعنی ’’اے ہوش مندو! تمہارے لیے قصاص ہی میں زندگی ہے!‘‘لیکن دوسری طرف اسلام کی اخلاقی و روحانی تعلیمات ہیں جن کا تقاضا یہ ہے کہ زیادتی کرنے والے کو معاف کر دیا جائے‘ چنانچہ کہیں ارشاد ہوتا ہے : {وَ اَنۡ تَعۡفُوۡۤا اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی ؕ} (البقرۃ:۲۳۷) ’’اگر معاف کر دو تو یہ تقویٰ اور خداترسی سے قریب ترہے‘‘۔کہیں تشویق و ترغیب کے انداز میں فرمایاجاتا ہے : {وَ الۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ وَ الۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ ؕ} (آل عمران:۱۳۴) ’’وہ لوگ جو غصہ کو پی جائیں اور لوگوں کو معاف کر دیا کریں!‘‘ --- دیکھ لیجیے کہ عفو و قصاص ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں‘ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی معاشرہ ان میں سے صرف ایک پر استوار ہو سکتاہے۔ دونوں اپنے اپنے مقام و محل پر لازم و ناگزیر ہیں اور حسن معاشرت ان دونوں کے امتزاج ہی سے وجود میں آتا ہے۔

اسی پر قیاس کر کے سمجھ لیجیے کہ اسلام کے معاشی نظام کے بھی دوپہلو ہیں‘ چنانچہ ایک جانب اسلام کا قانونی اور فقہی نظامِ معیشت ہے جس کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ ایک نوع کی محدود سرمایہ داری (Controlled Capitalism) ہے۔ اس لیے کہ اس میں انفرادی سرمایہ کاری کی اجازت موجود ہے‘ اگرچہ اسے ’’سرمایہ داری‘‘ بننے سے بعض تحدیدی اقدامات نے روک دیا ہے۔ دوسری جانب اسلام کا اخلاقی و روحانی نظامِ معیشت ہے جس کے بارے میں میں پورے انشراحِ صدر سے عرض کرتا ہوں کہ وہ ایک نہایت اعلیٰ قسم کی روحانی اشتراکیت (Spiritual Socialism) ہے‘ اور ایسا کامل سوشلزم ہے کہ اس سے آگے کا تصور بھی ممکن نہیں۔ اس لیے کہ سوشلزم یا کمیونزم میں توپھر بھی انسانی ملکیت کا

اثبات موجود ہے‘ اگرچہ انفرادی نہیں اجتماعی‘ لیکن اسلام اپنی اخلاقی و روحانی اور صحیح تر الفاظ میں ایمانی تعلیم کی رو سے انسانی ملکیت کی کلی نفی کرتا ہے‘ چنانچہ قرآن حکیم میں بار بار یہ الفاظ آتے ہیں : {لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ } (البقرۃ:۲۸۴) ’’آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے ان سب کا مالک صرف اللہ ہے!‘‘ انسان کسی اور شے کا مالک تو کیا ہو گا‘ خواہ وہ زمین ہو‘ مکان ہو‘ ساز و سامان ہو‘ روپیہ پیسہ ہو‘ وہ تو خود اپنا اور اپنے وجود کا مالک بھی نہیں‘ اس کے ہاتھ‘ پائوں‘ اعضاء و جوارح اور جسم و جان اور اس کی کل توانائیاں سب اللہ کی ملکیت ہیں‘ اور وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں ان کا امین ہوں ‘ بقول شیخ سعدیؒ : ؎

**ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست**

**درحقیقت مالک ہر شے خدا ست**

یا بقول علامہ اقبال :

**رزقِ خود را از زمیں بردن رواست**

**ایں متاعِ بندہ و ملک خداست!**

اسلام کے اس روحانی سوشلزم کی رو سے‘ جس کا آغاز انسانی ملکیت کے تصور کی کلی نفی سے ہوتا ہے‘ اس دنیا میں انسان کا حق صرف اس کی ضروریات ہیں اور بس!! ضرورت سے زائد اس کے پاس جو کچھ ہے اس پر اس کو قانونی و فقہی حق حاصل ہو تو ہو حقیقی حق کوئی حاصل نہیں۔ یہ دراصل دوسروں کا حق ہے جسے اللہ نے صرف بطورِ امتحان اس کے تصرف میں دے دیا ہے تاکہ دیکھے کہ آیا وہ اسے حق داروں تک پہنچا کر اور ’’حق بحقدار رسید‘‘ والا معاملہ کر کے سرخرو ہوتا ہے یا دوسروں کے حق پر قبضہ ٔمخالفانہ جما کر بیٹھ رہتا ہے اور اس ’’قدرِ زائد‘‘کے بل پر ابنائے نوع پر دھونس جماتا ہے اور شادیوں اور دوسری تقریبات میں اس غصب شدہ دولت کو اللوں تللوں میں اڑا کر محروموں کے زخمی دلوں پر اور نمک چھڑکتا ہے!!--- اب جن کے دلوں میں ایمان واقعتا راسخ ہوجاتا ہے اور اللہ اور آخرت پر ان کا یقین محکم قائم ہو جاتا ہے اور ان کی نگاہ ہر دم {اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۱۵۶﴾ؕ} (البقرۃ) پر جمی رہتی ہے‘ ان کی روش لامحالہ پہلی ہوتی ہے‘ جس کو قرآن نے واضح کیا ان الفاظ میں: {وَ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَا ذَا یُنۡفِقُوۡنَ ۬ؕ قُلِ الۡعَفۡوَؕ} (البقرۃ:۲۱۹) ’’(اے نبیﷺ!) وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں ؟(یعنی اللہ کی راہ میں کس حد تک دے ڈالیں؟)کہہ دیجیے جو بھی زائد از ضرورت ہو!‘‘ اور جس کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا اپنے

اس شعر میں کہ ؎

**جو حرفِ ’’قُلِ الْعَفْو‘‘ میں پوشیدہ تھی اب تک**

**اِس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!**

پھر یہ بھی کہ اسے اپنا کوئی احسان نہ سمجھو‘ بلکہ یہ تو تھا ہی دوسروں کا حق۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی : {وَ الَّذِیۡنَ فِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ ﴿۪ۙ۲۴﴾لِّلسَّآئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ ﴿۪ۙ۲۵﴾} (المعارج) ’’اور جن کے مالوں میں معین حق ہے ‘سائلوں اور محروموں کا!‘‘اور {وَ اٰتِ ذَاالۡقُرۡبٰی حَقَّہٗ وَ الۡمِسۡکِیۡنَ وَ ابۡنَ السَّبِیۡلِ} (الاسرائ:۲۶) ’’اور ادا کرو قرابت داروں اور مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق!‘‘--- اس کے برعکس جو لوگ اس کائنات اور خود اپنی ذات و حیات کی اصل حقیقتوں سے بالکل بے خبر ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں ان کی روش دوسری ہوتی ہے ‘ جس کا اوّلین نتیجہ ہے اسراف اور انتہائی منزل ہے تبذیر!!--- اسراف کہتے ہیں جائز ضرورتوں پر ضرورت سے زائد خرچ کرنے کو اور یہ بھی بہت معیوب ہے۔ جبکہ تبذیر ہے بالکل بلاضرورت صرف نمود و نمائش اور اللوں اور تللوں میں روپیہ اڑانا اور یہ وہ جرم ہے جس کے مرتکبوں کو شیطان کے بھائی قرار دیا گیا۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی: {اِنَّ الۡمُبَذِّرِیۡنَ کَانُوۡۤا اِخۡوَانَ الشَّیٰطِیۡنِ ؕ} (الاسرائ:۲۷) ’’یقینا فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں‘‘۔ عاذنا اللّٰہ من ذٰلک!

الغرض اسلام کی روحانی و اخلاقی یا ایمانی تعلیمات کا حاصل اعلیٰ ترین اور عظیم ترین اور ہر اعتبار سے کامل ترین Spiritual Socialism ہے۔ لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ دوسرے رُخ کے اعتبار سے اسلام کا نظامِ معیشت یقینا ایک Controlled Capitalism ہے۔ اس لیے کہ اسلام قانونی و فقہی اعتبار سے افراد کو زمین‘ مکان ‘ ساز و سامان حتیٰ کہ ذرائع پیداوار تک پر ایسا حق تصرف عطا کرتا ہے جو کم از کم ظاہری اعتبار سے حق ملکیت سے کامل مشابہت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ حق تصرف یا حق ملکیت وراثتاً اولاد و اَحفاد کو منتقل بھی ہو سکتا ہے ۔ الغرض اپنے قانونی و فقہی نظام میں اسلام نے انسان کے جبلی تقاضوں کو بتمام و کمال ملحوظ رکھا ہے اور نجی ملکیت (private ownership) ‘ ذاتی حوصلہ مندی (personal incentive) اور آزاد معیشت (free-enterprise) کے اصولِ سہ گانہ کو قانونی سطح پر برقرار رکھ کر ’’سرمایہ کاری‘‘ کے لیے وسیع میدان پیدا کر دیا ہے۔ البتہ اس ضمن میں بعض نہایت اہم ‘بنیادی اور حد درجہ مؤثر احتیاطی تدابیر ایسی اختیار کی ہیں

جن کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں ’’صحت مند سرمایہ کاری‘‘ کی فضا تو قائم رہے‘ لیکن یہ ’’سرمایہ داری‘‘ کی صورت اختیار نہ کر لے۔ ان احتیاطی یا تحدیدی تدابیر کے بارے میں تفصیلی بحث میری موجودہ گفتگو کے موضوع سے خارج ہے‘ صرف اشارتاً عرض کر سکتا ہوں کہ سود (interest) ‘ سٹہ (speculation) اور احتکار (hoarding) وغیرہ کی حرمت کی اصل غرض و غایت یہی ہے جو میں نے بیان کی‘ یعنی سرمایہ کاری‘ سرمایہ داری نہ بن جائے‘ اور Capitalism بہرحال controlled رہے‘ ---البتہ اس حقیقت سے انکار صرف ہٹ دھرمی ہی سے کیا جا سکتا ہے کہ سرمایہ کاری خواہ کتنی ہی پابند کیوں نہ ہو فرق و تفاوت کو لازماً جنم دے گی اور اس سے اغنیاء (haves) اور فقراء (have-nots) کا وجود میں آنا ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ اگر کسی دوڑ میں دس افراد شریک ہوں اور خواہش یہ ہو کہ وہ سب برابر رہیں‘ نہ کوئی آگے بڑھے نہ پیچھے رہے تو اس کی تو ایک ہی صورت ممکن ہے‘ یعنی یہ کہ ان سب کو ایک رسے سے باندھ دیا جائے۔ بصورتِ دیگر تو لامحالہ کوئی آگے بڑھے گا اور کوئی پیچھے رہ جائے گا! گویااسلام کے قانونی و فقہی نظام میں ’جبری مساوات‘ (forced equality) کا کوئی وجود نہیں ہے۔ لیکن اتنی ہی بڑی اور اہم حقیقت یہ بھی ہے کہ اسلام کے نظامِ محاصل میں اسی فرق و تفاوت کے مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کے مقصد کو اوّلین اور مقدم ترین اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اغنیاء اور فقراء کی تقسیم کو اعتباری یا عارضی (arbitrary) نہیں رہنے دیا بلکہ اس کے لیے ایک باقاعدہ وباضابطہ حد ِفاصل کھینچ دی ہے جسے اصطلاحِ شرع میں ’’نصاب‘‘ کہتے ہیں‘ جس کا تعین اموال کی تقریباً تمام بڑی بڑی صورتوں میں کر دیا گیا ہے۔ مثلاً ساڑھے سات تولے یا اس سے زائد سونے کا مالک اغنیاء میں شمار ہو گا اور ساڑھے سات تولے سے کم رکھنے والا فقراء میں سے ---اور اسلام کے نظام محاصل کا ایک اہم رکن یعنی زکوٰۃ اغنیاء سے لی جائے گی اور فقراء میں تقسیم کر دی جائے گی‘ بقول نبی اکرمﷺ ((تُــؤْخَذُ مِنْ اَغْنِیَائِھِمْ وَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَائِھِمْ)) (متفق علیہ) اور اس طرح وہ تمام تقاضے بتمام و کمال اور باحسن وجوہ پورے ہو جاتے ہیں جنہیں اس دور میں ’’اجتماعی ضمانت‘‘ (collective insurance) یا سماجی تحفظ (social security)

سے تعبیر کیا جاتاہے۔

اور اس سب پر مستزاد ہے وہ روحانی و اخلاقی اور ایمانی و احسانی تعلیم جو اسلام اپنے ہر ماننے والے اور قرآن اپنے ہر پڑھنے والے کو مسلسل دیتا ہے کہ لذاتِ دنیوی اور تعیش و تنعم سے کنارہ کشی اختیار کرو۔ اپنی ضروریات کو کم سے کم کرو‘ اور حقیقی اور واقعی ضروریات سے جو بھی زائد ہو‘ اسے اللہ کی راہ میں دے دو اور یہ نہ سمجھو کہ مال میں واحد حق زکوٰۃ ہی ہے۔ یہ تو کم از کم اور ناگزیر قانونی ضابطہ ہے۔ ایمان کا اصل تقاضا و مطالبہ اس سے بہت آگے ہے۔ بموجب فرمانِ نبویﷺ : ((فِی الْمَالِ حَقٌّ سِوَی الزَّکَاۃِ)) (ترمذی) ’’مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی بہت سے حقوق ہیں‘‘۔اور اچھی طرح جان لیجیے کہ نظامِ اسلامی کا اصل حسن و جمال اور اس کی اصل برکات اُس کی اسی دوسری اور تکمیلی تعلیم و تلقین میں مضمر ہیں!!

اسلامی نظم ِمملکت میں نظامِ محاصل کے بارے میں ایک اہم اور اصولی بات اور بھی ہے جو مدنظر رہنی ضروری ہے‘ اور وہ یہ کہ اسلامی ریاست اصلاً ایک نظریاتی ریاست ہے اور اگرچہ اس کی حدود میں بسنے والے تمام شہری بلاامتیازِ مذہب و ملت بعض اعتبارات سے بالکل مساوی بھی ہیں‘ جیسے حرمت جان و مال میں ‘تاہم بہت سے اعتبارات سے شہریوں کا دو حصوں میں منقسم ہونا لازم ولابد ہے۔ یعنی ایک وہ جو اس نظریے کو ماننے والے ہوں جس پر ریاست قائم ہے اور دوسرے وہ جو اسے نہ مانتے ہوں۔چنانچہ اسلام کے نظامِ محاصل کے اعتبار سے بھی ایک اہم اور بنیادی تقسیم اسی اعتبار سے ہے کہ بعض کی ادائیگی صرف مسلمانوں پر ہے ‘یعنی اسلامی ریاست کے اصول و مبادی کے ماننے والوں پر اور بعض کی غیر مسلموں پر یعنی ان پرجو ان اصولوں کو نہیں مانتے۔ پھر یہ کہ ان دونوں کی نوعیت میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے اور ان کے مداتِ صرف میں بھی اساسی اور بنیادی فرق ہے۔ چنانچہ مسلمانوں سے نقدی کی تمام صورتوں اور اموالِ تجارت پر زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے جس کی شرح کل مالیت کا اڑھائی فیصد ہے۔ ان کی زرعی اراضی میں سے نہری یا چاہی زمینوں کی کل پیداوار کا بیسواں حصہ وصول کیا جاتا ہے یعنی پانچ فیصد‘ اور بارانی زمینوں کی پیداوار سے کل کا دسواں حصہ وصول کیا جاتا ہے یعنی دس فیصد--- اور ان دونوں کی نوعیت ٹیکس کی نہیں ہے بلکہ اصلاً عبادت کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شرح

بھی بالکل معین ہے جس میں کسی ردّوبدل کی گنجائش نہیں ہے‘ ورنہ ان کی حیثیت عبادت کی نہیں رہے گی بلکہ صرف ایک ٹیکس کی رہ جائے گی۔ اسی طرح ان کی مداتِ صرف بھی معین ہیں‘ ان کے علاوہ کسی مد میں انہیں صرف نہیں کیا جا سکتا‘ جن کا مجموعی حاصل وہ اجتماعی ضمانت یا سماجی تحفظ ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے!

اس کے برعکس غیر مسلموں کے اموال سے جزیہ وصول کیا جاتا ہے اور ان کی زمینوں سے ’’خراج‘‘ اور ان دونوں کی حیثیت خالصتاً ٹیکس کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کوئی شرح بھی معین نہیں‘ ان کا تعین حکومت وقت کی صوابدید پر ہے اور اسی طرح ان سے حاصل شدہ رقوم کے صرف پر بھی کوئی پابندی نہیں‘ جملہ شعبہ ہائے حکومت کے اخراجات اور نظم و انصرامِ مملکت کے تمام تقاضے ان سے پورے کیے جا سکتے ہیں۔ (۱)

اسلامی حکومت کی آمدنی کا ایک اور شعبہ جس کی شرح معین ہے‘ وہ اموالِ خمس ہیں یعنی پانچواں حصہ یا بیس فیصد جو اموالِ غنیمت‘ کنز یعنی دفینے‘ اور رکاز یعنی معدنیات سے وصول کیا جاتا ہے۔ ان کی جس طرح شرح وصولی زکوٰۃ و عشر کی طرح

\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_\_

(۱) ایک نہایت اہم اور قوی اور فقہ حنفی کی رو سے نہایت محکم رائے یہ بھی ہے کہ پاکستان کی جملہ اراضی ’’خراجی‘‘ کے حکم میں ہیں نہ کہ ’’عشری‘‘کے حکم میں۔ گویا اگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ کی مزارعت کے مطلقاً حرام ہونے کی رائے کو کسی وجہ سے چھوڑ کر صاحبین یعنی قاضی ابویوسفؒ اور امام محمد شیبانی ؒ کی رائے پر عمل کیا جائے تو بھی پاکستان کی جملہ اراضی کے کاشت کار براہِ راست ریاست پاکستان کے ’’مزارع‘‘ ہوں گے اور ان کا ’’خراج‘‘ براہِ راست خزانہ عامرہ میں جمع ہو گا‘ جس سے taxation کے پورے نظام میں انقلاب آ جائے گا اور غالباً انکم ٹیکس کی تو سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ اس موضوع پر پروفیسر رفیع اللہ شہاب صاحب کی ایک مختصر تحریر اس کتابچہ کے آخر میں درج کی جا رہی ہے۔ پروفیسر صاحب اپنے بعض نظریات کی بنا پر ہمارے دینی حلقوں میں شدید ’’متنازعہ‘‘ شخصیت بن چکے ہیں ‘لیکن ہمیں تو ہدایت ہے کہ ’’انظروا الی ما قال ولا تنظروا الی من قال‘‘ یعنی یہ دیکھو کہ کہا کیا جا رہا ہے‘ اسے نظر انداز کر دو کہ کہنے والا کون ہے! لہٰذا اس معاملے میں ان کی رائے پر جملہ اہل علم کو غور کرنا چاہیے۔ (اسرار احمد)

معین ہے اسی طرح مداتِ صرف بھی صرف وہی ہیں جو زکوٰۃ اور عشر کی۔اس فہرست میں صرف ایک اور شق کا اگر اضافہ کر لیا جائے تو ایک پہلو سے بات مکمل ہو جائے گی اور وہ یہ کہ زکوٰۃ اور عشر کے علاوہ جو صدقات ِ نافلہ مسلمان اپنی مرضی سے فی سبیل اللہ دیں ان کے بارے میں انہیں اختیار ہے کہ چاہے از خود فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیں چاہے اسلامی حکومت کے حوالے کر دیں (بخلاف زکوٰۃ اور عشر کے کہ وہ لازماً حکومت ہی کو ادا کرنے ہوں گے!) اگر وہ ایسی رقوم بھی حکومت کے حوالے کر دیں تو وہ بھی صرف ان ہی مدات میں صرف ہوں گی جن میں زکوٰۃ اور عشر کی رقوم کا صرف جائز ہے۔

اس کے بعد نمبر آتا ہے اسلامی حکومت کے عام محاصل کا ‘جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) فے : یعنی وہ اموال جو غیر مسلموں سے جنگ کے سوا کسی اور طریق سے حاصل ہوں۔ اپنی اصل کے اعتبار سے جزیہ اور خراج بھی فے ہی کی قسمیں ہیں‘ لیکن عرفِ عام میں یہ لفظ ان اموال پر بولا جاتا ہے جو حاصل تو متحارب غیر مسلموں (Hostile Non-Muslims) سے ہوئے ہوں‘لیکن ان میں فی الواقع جنگ اور خونریزی کی نوبت نہ آئی ہو۔

(۲) کراء الارض : یعنی حکومت کی مملوکہ اراضی سے حاصل شدہ لگان۔

(۳) عشور : ا درآمدی و برآمدی محصولات جن کے بارے میں ایک زمانے میں شرح کا تعین کچھ اس طرح ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کے اموال میں سے اڑھائی فیصد‘ اسلامی حکومت کے غیر مسلم شہریوں یعنی ذمیوں کے اموال میں سے پانچ فیصد اور دوسرے غیر مسلموں سے دس فیصد لیا جاتا تھا۔ لیکن یہ شرحیں کسی نص پر مبنی نہیں ہیں اور ان میں بھی کمی بیشی ہوسکتی ہے جس میں ظاہر ہے درآمد و برآمد کے کاروبار کے توازن اور عالمی منڈی کے اتار چڑھائو کو اصل دخل حاصل ہو گا!

(۴) ضرائب : یعنی وہ مزید ٹیکس جو حکومت حسب ِ ضرورت شہریوں پر عائد کر سکتی ہے۔ عام حالات میں بھی اگر دفاع اور نظم مملکت کی ضروریات اور فقراء کی احتیاجات مندرجہ بالا تمام مدوں سے پوری نہ ہو رہی ہوں اور خاص اور ہنگامی حالات میں بھی‘ جیسے زمانہ ٔجنگ یا قحط سالی یا کسی عمومی

depression کے باعث عام بے روزگاری وغیرہ۔ ایسی خاص صورتوں میں اسلامی حکومت کو اغنیاء پر ٹیکس لگانے کا غیر محدود اختیار حاصل ہے۔

(۵) اموالِ فاضلہ : یعنی متفرق آمدنی جیسے کوئی شہری اگر لاوارث فوت ہو تو اس کی کل جائیداد اسلامی حکومت کی ملکیت قرار پاتی ہے۔ اسی طرح کوئی مسلمان مرتد ہو جائے تو اس کا کل مال بھی بیت المال میں داخل ہو جاتا ہے اور اگر کوئی غیر مسلم شہری بغاوت کا مرتکب ہو جائے تو اس کی کل میراث بھی اسلا می حکومت کا حق ہے۔

(۶) اوقاف : وقف اگر کسی خاص اور متعین مقصد کے لیے ہوں تو ان کی آمدنی انہی مصار ف پر خرچ ہو گی‘ لیکن اگر کوئی شہری عام فی سبیل اللہ وقف کرتا ہے تو گویا وہ اسلامی حکومت کی ملکیت شمار ہو گا اور اس کی کل آمدنی بیت المال میں شامل کی جائے گی۔ان میں سے فے‘ اموالِ فاضلہ اور عام اوقاف تو کل کے کل بیت المال میں داخل ہوں گے‘ جن کے ضمن میں کسی شرح کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا‘ البتہ کراء الارض‘ ضرائب اور عشور کی حیثیت taxes کی ہے اور ان کی شرح وقتاً فوقتاً تبدیل کی جا سکتی ہے جیسے بھی ضرورت داعی ہو۔ اسی طرح ان کی حاصل شدہ آمدنی کے صرف پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ یہ انتظامِ مملکت کے اخراجات اور رفاہِ عامہ‘ عمومی فلاح و بہبود اور public works سب پر خرچ کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ ایک رائے یہ ہے کہ ضرائب اور عشور میں سے بھی جو رقوم مسلمانوں سے حاصل ہوں گی ان کی مدات ِصرف بھی صرف وہی ہوں گی جو زکوٰۃ ‘ عشر اور صدقات کی ہیں۔

اس تفصیل سے ایک جانب تو وہ حقیقت بالکل مبرہن ہو گئی جو پہلے عرض کی جا چکی ہے‘ یعنی یہ کہ اسلامی نظم مملکت میں taxation کے اعتبار سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین بڑابنیادی فرق ہے ‘اور یہ فرق فطری بھی ہے اور عقلی و منطقی بھی۔ اس لیے کہ ایک غیر مسلم کے لیے اسلامی حکومت بس ایک امن و امان اور نظم و نسق قائم رکھنے والے ادارے کی حیثیت رکھتی ہے اور بس! جبکہ ایک مسلمان کے نزدیک اسلامی حکومت زمین پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولﷺ کی نمائندہ ہوتی ہے

اور اس کا مقصد صرف دنیوی فلاح و بہبود ہی نہیں ہوتا‘ اُخروی فوز و فلاح بھی ہوتا ہے‘ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ قائم ہی ہوتی ہے نظریہ ٔاسلامی کی ترویج واشاعت اور دنیا میں اسلام کی تبلیغ اور غلبہ و اقامت کے لیے۔ اس لیے اس کی خیر خواہی و وفاداری اور اس کا بقاء و استحکام مسلمان کے عین دین و مذہب کا تقاضا ہے۔ چنانچہ وہ اس کو اپنی کمائی یا اللہ کے فضل میں سے جو کچھ دیتا ہے اسے عبادت سمجھ کر دیتا ہے۔ اس کے اس تصور کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے اس حقیقت سے کہ ان کی فرضیت اور شرح ادائیگی اللہ اور اُس کے رسولﷺ کی طرف سے ہیں۔ حکومت وقت صرف جمع کرنے والی (collector) اور تقسیم کرنے والی distributor) ہے نہ کہ عائد کرنے والی۔ اور عدمِ ادائیگی یا ادائیگی میں کتمان و فریب صرف قانون کی خلاف ورزی ہی نہیں ہے بلکہ گناہ اور معصیت ہے جس کا وبال ‘ابدی اور اُخروی زندگی میں بھگتنا پڑے گا۔

دوسری حقیقت یہ بھی واضح ہو گئی کہ مسلمان شہریوں سے اسلامی حکومت کو جو کچھ وصول ہو اس میں سے اکثر کا اوّلین مصرف اس خلیج کو پاٹناہے جو اسلام کے قانونی و فقہی نظام میں موجود آزاد معیشت کا لازمی نتیجہ ہے ‘خواہ وہ کم ہو یا بیش!

تیسری اہم حقیقت جو دنیا کے دوسرے اکثر نظام ہائے ٹیکسیشن سے مختلف ہے وہ یہ کہ اسلام کا غالب رجحان یہ ہے کہ ٹیکس کے لیے اساس و بنیاد نہ فرد بحیثیت فرد ہو جس پر poll یا tax capitation عائد کیا جاتا ہے‘ نہ آمدنی ہو جس پر income tax کی بنیاد ہے‘ نہ وسعت خرچ یا capacity to spend ہو ‘بلکہ کل پیداوار یا ملکیت (total produce or possession) ہو‘جیسا کہ زکوٰۃ یا عشر یا خمس سے ظاہر ہوتا ہے۔ ٹیکس عائد کرنے کی ان دوسری اساسات کے مقابلے میں اسلام کی اختیار کردہ یہ اساس کن مصلحتوں پر مبنی ہے‘یہ ایک دقیق فنی مسئلہ ہے‘ تاہم اس ضمن میں ایک کوشش تو سید نزہت بخاری صاحب نے اپنے اس مقالے میں کی ہے جس کا ذکر میں آغاز میں بطور لطیفہ کر چکا ہوں۔ ان کی تحقیق کا لب لباب یہ ہے کہ انکم پر ٹیکس عائد کرنے سے افراطِ زر یا inflation کا رجحان بڑھتا ہے جبکہ

’’total produce or possession‘‘ پر ٹیکس عائد کرنے سے اس کا قلع قمع ہوتا ہے۔ میں ایک غیر فنی انسان کی حیثیت سے ان کی دلیل کوپورے طو رپر سمجھ نہیں پایا‘ تاہم یہ ایک اہم خیال ہے جو ایک واقف حال شخص نے ظاہر کیا ہے ‘اس پر توجہ دی جانی چاہیے۔

میرے سامنے ایک عامی کی حیثیت سے اس کی ایک دوسری اور عظیم تر مصلحت آئی ہے اور وہ یہ کہ آمدنی کا صحیح صحیح حساب رکھنا ’’لانا ہے جوئے شیر کا!‘‘ کا مصداق ہے۔ اور اس کے لیے بہت لمبے چوڑے اور elaborate accounting کی ضرورت ہے‘ جبکہ اسلام کے نظامِ محاصل میں سے اکثر کے لیے اس کی کوئی حاجت نہیں رہتی۔ اب ظاہرہے کہ بڑے بڑے شراکتی اداروں یا limited companies کے لیے تو تفصیلی حساب کتاب ویسے بھی ناگزیر ہے تاکہ حصہ داروں کے مابین منافع کی تقسیم منصفانہ ہو سکے ‘اور اگر یہ ادارے اپنے حجم (size) کے اعتبار سے اس accounting پر زرِکثیر صرف کریں تو کوئی زیادہ بار بھی نہ ہو گا۔ لیکن آبادی کی عظیم اکثریت جو چھوٹے چھوٹے کاروبار لیے بیٹھی ہے اس کے لیے حساب کتاب کا یہ معاملہ خالص دردِ سر بھی ہے اور محض ضیاع بھی۔ یہ معاملہ چھوٹے چھوٹے دکانداروں ہی کا نہیں ہے‘ ہمارے درمیانی طبقے کی عظیم اکثریت کا ہے۔ آپ ایک ڈاکٹر کا تصور کریں جو روزانہ اوسطاً سو ڈیڑھ سو مریض دیکھتا ہے‘ اب اگر وہ اپنی آمدنی کا صحیح صحیح حساب رکھنا چاہے اور وہ بھی ایسا جو انکم ٹیکس آفیسر کے نزدیک ’’قابل تصدیق‘‘ ہو تو اسے ہر مریض کا نام اور اس کو روزانہ دی جانے والی ادویات کی تفصیل کے علاوہ ادویات کی خرید وفروخت کا پورا حساب اور ان کا مکمل سٹاک اکاؤنٹ رکھنا ضروری ہو گا جس کے لیے ایک کلرک اور ایک اکائونٹینٹ کی خدمات لازمی ہیں۔ اور ان سب پر جو خرچ آئے گا وہ خالص ہو گا۔ وقِس علٰی ذٰلک۔ اس کے برعکس اسلام کے نظامِ محاصل میں اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص سال کے آخر میں اپنی مالی حالت کا حساب بآسانی کر سکتا ہے اور اس پر زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ ربِّ الْعَالَمِیْنَ!

٭٭٭

عشری اور خراجی اراضی

پاکستان میں عشری نہیں صرف خراجی زمین ہے

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

اسلامی ریاست میں حکومت کی آمدنی کی سب سے بڑی مد خراجی زمین ہے‘ اور آج بھی اس مد سے اتنی آمدنی حاصل ہو سکتی ہے کہ کسی مزید ٹیکس کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اسلامی قانون کے مطابق تمام مفتوحہ ممالک‘ جن میں برصغیر پاکستان و بھارت شامل ہیں‘ کی اراضی خراجی کے ذیل میں آتی ہیں۔ تمام اسلامی ادوار میں اس اسلامی قانون پر سختی سے عمل ہوتا رہا ہے‘ یہاں تک کہ ۱۷۹۳ء میں انگریزوں نے بنگال کے بندوبست دوامی کے ذریعے یہاں کی اراضی کی حیثیت بدل دی اور غیر حاضر زمینداروں کا ایک طبقہ پیدا کر دیا۔ ان زمینداروں نے اپنی طرف سے عشر ادا کرنا شروع کیا اور کوشش کی کہ علماء اس کے جواز کا فتویٰ دیں‘ لیکن چونکہ ایک دفعہ خراجی قرار دی ہوئی زمین ابد تک عشری میں تبدیل نہیں کی جا سکتی‘اس لیے دار العلوم دیوبند کے دار الافتاء میں اس بارے میں جو سینکڑوں فتوے پوچھے گئے ان سب کا یہی جواب دیا گیا کہ یہ اراضی کسی صورت میں عشری میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ ہاں ‘ احتیاطاً کوئی عشر ادا کردے تو اس کی اپنی مرضی ہے۔

اس موضوع پر راقم کا ایک مفصل مضمون نوائے وقت میں شائع ہو چکا ہے۔ مجھے توقع تھی کہ علماء کرام اس سلسلے میں کچھ وضاحت فرمائیں گے‘ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاں اسلامی نظام کے نفاذ کے نعرے تو تیس سال سے لگ رہے ہیں لیکن اس مقصد کے لیے جس قدر ’’ہوم ورک‘‘ کی ضرورت ہے اس سے پہلوتہی کی جاتی رہی۔ اس موضوع پر راقم نے پندرہ سال پہلے تحقیقی کام شروع کیا اور ۱۹۶۹ء میں اسلام آباد میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس میں ایک مختصر سی میٹنگ میں اسلامی نظریاتی کونسل کے اس وقت کے چیئرمین علامہ علائو الدین صدیقی نے نظامِ عشر پر گفتگو شروع کی تو راقم نے بہت

سے اہل علم کی موجودگی میں اس کی تصحیح کی کہ ہمارے ملک کی اراضی ’’خراجی‘‘ کے ذیل میں آتی ہیں جن پر عشر کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اور اس کے ساتھ ہی اسلامی فقہ کی معتبر کتابوں سے تمام حوالہ جات ان کے سامنے رکھ دیے۔ علامہ شاہ محمد جعفر پھلواری اور ادارہ تحقیقات اسلامی کے سکالروں نے میرے نقطہ ٔنظر کی تائید کی۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ میں نظریاتی کونسل کی رہنمائی کے لیے ایک مسلسل کتاب اس موضوع پر تیار کر دوں جس کی نگرانی مسٹر خالد اسحاق ایڈووکیٹ کریں گے جو اس وقت اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک سینئر رکن تھے اور آج بھی اس منصب پر فائز ہیں۔ راقم نے خالد صاحب کی لائبریری میں بیٹھ کر دوماہ میں مطلوبہ کتاب تیار کر کے ان کے حوالے کی اور ساتھ ہی اس کے مطابق ۱۹۷۹ء کا قومی بجٹ بھی بنا دیا جس میں موجودہ ٹیکسوں میں سے ایک ٹیکس بھی نہ تھا۔ میرا تحقیقی کام ان حضرات کے لیے اچنبھے کی بات تھی‘ اس لیے انہوں نے مختلف ذرائع سے اسے چیک کرایا۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کے اسکالروں نے بھی اس کی تصدیق کر دی اور پھر ادارہ نے اسے کتاب کی صورت میں ’’اسلامی ریاست کا مالیاتی نظام‘‘ کے عنوان سے شائع کر دیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب جب زکوٰۃ اور عشر آرڈیننس نافذ کیا گیا ہے تو اسلامی نظریاتی کونسل کے سامنے یہ تفصیلات نہیں تھیں۔ اتفاق سے انہی دنوں مسٹر خالد اسحاق ایڈووکیٹ جن کی نگرانی میں راقم نے یہ تحقیقی کام کیا تھا ‘ ادارہ تحقیقات اسلامی میں تشریف لائے‘ جہاں سکالرز اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ راقم نے خالد صاحب کو یاد دلایا کہ انہوں نے عشر کا نیا قانون بناتے وقت پچھلے تمام تحقیقی کام کو نظرانداز کر دیا ہے اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ان کے گوش گزار کی کہ اُمت مسلمہ کے ستر فقہی مذاہب کہ جن میں سے اکثر اب ختم ہو چکے ہیں ‘ کے تمام فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے اور اسلامی فقہ کی ڈیڑھ ہزار کتابوں میں کوئی ایسی دلیل نہیں ملتی جس کے تحت پاکستان کی اراضی کو عشری کے ذیل میں لایا جا سکے۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کے سکالروں نے تو کچھ ناراضگی کا بھی اظہار کیا کہ یہ ادارہ اسلامی قانون کے نفاذ کے لیے تحقیقی مواد فراہم کرنے کی خاطر قائم کیاگیا ‘لیکن اگر ان کی تحقیق کو درخورِ اعتنانہیں سمجھا جاتا تو پھر اس ادارے پر غریب عوام کے کروڑوں روپے خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے خالد صاحب سے یہ بھی درخواست کی کہ صدر صاحب نیک نیتی سے اسلامی قانون نافذ کرنا چاہتے ہیں‘ اس لیے خدا کے لیے ان کے سامنے صحیح تفصیلات پیش کی جائیں۔ خالد صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ نظریاتی کونسل کے چیئرمین کی توجہ

اس طرف دلائیں گے۔علمائے کرام کو اس مسئلہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلانے کے لیے فقہ کی ابتدائی کتاب ’’مالابُدّ منہ‘‘ کا حوالہ یہاں غیر مناسب نہ ہوگا۔ یہ کتاب کروڑوں کی تعداد میں شائع ہوتی ہے اور مصنف نے علماء حضرات کو نظریاتی بحثوں میں گم ہونے سے بچانے کے لیے اس میں سے وہ تمام بحثیں خارج کر دی ہیں جن کا برصغیر پاکستان و بھارت سے کوئی تعلق نہیں۔ عشر کا مسئلہ انہوں نے ایک چوتھائی سطر میں حل کر دیا ہے کہ چونکہ برصغیر میں کوئی عشری زمین نہیں اس لیے عشر کے مسائل بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اور آخر میں فقہ کی سب سے بڑی کتاب ’’فتاویٰ عالمگیری‘‘ کا ایک حوالہ ملاحظہ ہو جس کے مطابق اگر کسی مسلمان علاقے پر دشمن کچھ عرصے کے لیے غالب آ جائے اور مسلمان اسے پھر دوبارہ حاصل کر لیں تو اس کی اراضی اپنی اصل یعنی خراجی حیثیت کی طرف لوٹ آئیں گی (جلد سوم‘ اردو ایڈیشن‘ ص۵۲‘ مطبوعہ شیخ غلام علی لاہور)۔ امید ہے علماء حضرات فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ کا مطالعہ فرما کر اس کی صحیح اسلامی حیثیت عوام کے سامنے لائیں گے۔

===========================

**خدا آں ملتے را سروری داد!**

**کہ تقدیرش بدست خویش بنوشت**

**بہ آں قومے سروکارے نہ دارد**

**کہ دہقانش برائے دیگراں کشت**

**٭**

**جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی**

**اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو**

**٭**

**خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعل ناب**

**از جفائے دِہ خدایاں کشت دہقاناں خراب**

**انقلاب!**

**انقلاب ------- اے --------- انقلاب!**

**(اقبال)**